علیگڑھ تا ایبٹ آباد

مع

علیگیات۔ علیگڑھ کے چند بزرگوں کی یادیں

اور

علیگڑھ کے کچھ طالب علم ساتھی

بشکریہ:۔ جناب کامران مقصود رضوی صاحب (واہ کینٹ اٹک)

ذخیرہ کتب:۔ محمد احمد ترازی (کراچی)

پروفیسر ایس۔ایم۔ شفیع

بی۔اے (علیگ)۔بی۔ایس سی (اکنامکس) لندن

بیرسٹر۔ایٹ۔لا

علیگڑھ تا ایبٹ آباد

مع

علیگیات۔ علی گڑھ کے چند بزرگوں کی یادیں

اور

علیگڑھ کے کچھ طالب علم ساتھی

از

پروفیسر ایس۔ ایم۔ شفیع

بی۔ اے (علیگ)۔ بی۔ ایس سی (اکنامکس) لندن

بیرسٹر۔ ایٹ۔ لا (لندن)

سرسید اکادمی

ایوانِ سرسید، 19-اتاترک ایونیو، G-5/1، اسلام آباد

سرسید اکادمی 2013ء

کتاب: علی گڑھ تا ایبٹ آباد

مصنف: پروفیسر ایس ایم شفیع (علیگ)

تعداد: 100

اہتمام: بریگیڈیئر اقبال شفیع (علیگ)

قیمت: 250روپے

آئی ایس بی این: 978-969-9626-03-6

مارچ 2013ء سرسید میموریل سوسائٹی، اسلام آباد

اس کتاب کی فروخت سے حاصل شدہ آمدنی، سرسید میموریل سوسائٹی ایوانِ سرسید 19-اتاترک ایونیو، G-5/1 اسلام آباد پاکستان کے لیے وقف ہے۔

ترتیب

ج۔ علیگڑھ کے چند بزرگوں کی یادیں

د۔ علی گڑھ کے کچھ طالب علم ساتھی

علی گڑھ کا ایک فیض

سرسید احمد خان

پیش لفظ

علی گڑھ میں کردار سازی

بریگیڈیئر اقبال شفیع (علیگ) فرزند پروفیسر ایس۔ ایم شفیع

علی گڑھ میں کردار سازی کی روشن مثالیں جن کے بارے میں ذاتی طور پر نہ صرف میں جانتا ہوں بلکہ اُن کو نہایت قریب سے دیکھا ہے وہ ہیں میرے قبلہ والد صاحب پروفیسر ایس۔ ایم شفیع مرحوم اور میری نہایت نیک اور خدا ترس والدہ صاحبہ بیگم خدیجہ شفیع صاحبہ مرحومہ۔ یہ تو صاف ظاہر ہے کہ میں اپنے والدین کا تادم آخر احسان مند رہونگا کہ جس طرح انہوں نے اپنی ذاتی مثالیں قائم کر کے میری تربیت کی۔ لیکن اس رشتے کے علاوہ میں ان دونوں بزرگوں کی مثالیں یہاں اس لئے بھی پیش کر رہا ہوں کہ انہوں نے نہ جانے اپنے کتنے شاگردوں کی زندگیاں سنوار دیں۔

سر سیدؒ کی صحیح سوچ' نیک نیتی اور عمل پیہم کی بدولت جو مدرستہ العلوم 1875ء میں گیارہ بچوں پر مشتمل ''کچی بارک'' میں قائم ہوا اور 1877ء میں کالج بنا اور 1881ء میں محمڈن اینگلو اورینٹل کالج (M.A.O) کہلایا وہ پھر بعد میں 1920ء میں مسلم یونیورسٹی کے

درجے تک پہنچا' اس عظیم درسگاہ سے جو طالبعلم نکلے وہ اسی سوچ اور جذبے کے علمبردار تھے کہ جس کی بنا سر سیدؒ نے اپنے ہاتھ سے ڈالی تھی۔ اس عمل کو سمجھنے کیلئے ایک مثال قبلہ والد صاحب کی پیش کر رہا ہوں کہ وہ پورے پچاس سال (M.A.O. College)اور مسلم یونیورسٹی سے منسلک رہے اور جنہوں نے ہزار ہا طلباء کی زندگیوں کو سنوارا اور جو سر سیدؒ کے خواب کی تعبیر میں ہمہ تن فنافی علی گڑھ تھے۔

حسنِ اتفاق سے والد صاحب قبلہ کا سن پیدائش وہی 1898ء ہے کہ جو سر سیدؒ کا سنِ وفات ہے۔ والد صاحب فرماتے تھے کہ ان کے بزرگ مشرقی پنجاب کے علاقہ ''شام چوراسی'' میں رہتے آئے تھے۔ پہلے گاؤں کا نام صرف ''شام'' تھا اس لئے وہاں کے باشندے ''شامی'' کہلاتے تھے جو نامور بزرگ حضرت شامی صاحبؒ کی تبلیغ کی وجہ سے مشرف بہ اسلام ہوئے تھے۔ جہانگیر بادشاہ کے عہد میں ان کے بزرگوں کو 84 گاؤں کی لگان کی معافی ملی تھی اس لئے گاؤں کا نام ''شام چوراسی'' پڑ گیا۔ تلاشِ معاش کے سلسلے میں کچھ لوگوں نے قریب کے بڑے شہر جالندھر میں سکونت اختیار کر لی۔ ہمارے دادا جان (خان بہادر ڈاکٹر) عبدالرحمٰن صاحب نے دسویں جماعت یہاں ہی پاس کی اور پھر لاہور (۱۸۹۵ء) میڈیکل کالج سے چار سال کی تعلیم کے بعد (LM&S) کی سند حاصل کی۔ اُن دنوں ایران میں پلیگ کی بیماری پھیلی ہوئی تھی تو دادا جان قبلہ نے فیصلہ کیا کہ چونکہ وہاں کے مسلمانوں کو ڈاکٹروں کی ضرورت ہے تو وہاں جا کر شہر ''لنگاہ'' میں سکونت اختیار کی جائے اور وہاں کے مسلمانوں کا علاج شروع کیا جائے۔ کیونکہ مقامی حکیم سرجری اور آپریشن سے ناواقف تھے' اس لئے دادا جان کے اچھے سرجن ہونے کی وجہ سے بہت اہمیت بڑھ گئی۔ انہوں نے وہاں پانچ سال کے قیام میں شہرت اور دولت دونوں کمائی۔ واپس

Our Grand Father K. B. Dr. Abdul Rehman who met Nawab Viqar-ul-Mulk at Aligarh and got his three sons admitted in the M.A.O College High School in 1909, before proceeding for his appointment as British Vice Consul at Jeddah from 1909 to 1914 where he was instrumental in establishing "The Shifa Khana-e-Hijaz". He later served as British Consul at Tehran from 1915-1920.

بشکریہ

جناب کامران مقصود رضوی صاحب (راولپنڈی)

ذخیرہ کتب

محمد احمد ترازی (کراچی)

جالندھر آئے ہی تھے کہ نیک شہرت کی وجہ سے ان کو حکومت ہند نے ڈاکٹری کی سرکاری ملازمت میں لیکر صوبہ یو۔ پی میں بطور سول سرجن تعینات کیا۔ دادا جان یو۔ پی کے مختلف شہروں مثلاً لکھنؤ، باندہ، مظفر نگر، اناد میں بطور سول سرجن تعینات رہے۔

چونکہ نیک نامی کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے ان کے ہاتھ میں شفا بھی دی تھی اس لئے بہت کامیاب ڈاکٹر ہوئے اور اسی بنا پر 1909ء میں حکومت ہند نے ان کی بطور ''برٹش وائس قونصل'' جدہ میں تقرری کر دی جہاں نہ صرف انہوں نے ''شفاخانہ حجاز'' کے سلسلے میں خدمات سرانجام دیں بلکہ مسلمان حجاج کی دیکھ بھال بطور ایک ڈاکٹر اور وائس قونصل دونوں حیثیتوں میں کی۔ اور ''شفاخانہ حجاز'' کے قیام میں بڑا کردار ادا کیا۔ آگے چل کر وہ ترقی پا کر تہران میں برٹش قونصل کی حیثیت سے ۵ سال رہے۔ ''شفاخانہ حجاز'' کے سلسلے میں مناسب ہوگا کہ یہاں قبلہ دادا جان مرحوم کا واقعہ بیان کروں جو میں نے قبلہ والد صاحب مرحوم سے سنا۔ جدّہ میں برٹش وائیس قونصل (1909-1914) ہونے کے علاوہ دادا جان چونکہ طبّی ڈاکٹر بھی تھے تو انہوں نے وہاں کے لوگوں اور خاص طور سے حاجیوں کے علاج معالجہ کے لئے ''حجاز ڈیپنسری'' کے نام سے ایک ہسپتال کی بنیاد رکھی۔ اس سلسلے میں چونکہ مالی امداد کی ضرورت تھی تو وہ اور لوگوں کے علاوہ ڈاکٹر سر محمد اقبالؒ سے بھی ملے اور ہسپتال کے لئے چندہ طلب کیا۔ والد صاحب مرحوم فرماتے تھے کہ علامہ اقبالؒ نے چندہ تو دیا مگر ساتھ ہی ''شفاخانۂ حجاز'' کے نام سے ایک دلچسپ نظم بھی لکھ دی جو ''بانگِ درا'' میں شامل ہے:

شفاخانۂ حجاز

اک پیشوائے قوم نے اقبالؔ سے کہا ۔۔۔ کُھلنے کو جدّہ میں ہے شفاخانۂ حجاز

ہوتا ہے تیری خاک کا ہر ذرّہ بے قرار ۔۔۔ سُنتا ہے تُو کسی سے جو افسانۂ حجاز

دستِ جنوں کو اپنے بڑھا جیب کی طرف

مشہور تو جہاں میں ہے دیوانۂ مجاز

دار الشفا حوالئ بطحا میں چاہئے

نبضِ مریض پنجۂ عیسیٰ میں چاہئے

میں نے کہا کہ موت کے پردے میں ہے حیات

پوشیدہ جس طرح ہو حقیقت مجاز میں

تلخابۂ اجل میں جو عاشق کو مِل گیا

پایا نہ خضر نے مئے عمرِ دراز میں

اوروں کو دیں حضور! یہ پیغامِ زندگی

میں موت ڈھونڈتا ہوں زمینِ حجاز میں

آئے ہیں آپ لے کے شفا کا پیام کیا؟

رکھتے ہیں اہلِ درد مسیحا سے کام کیا؟

بہر حال 1909 میں جب جدّہ جانے لگے تو سوچا کہ اپنے تین بیٹوں کی تعلیم کا کیا ہوگا، تو طے پایا کہ ان کو علی گڑھ بھیج کر وہاں M.A.O College میں داخل کرا دیا جائے۔ چونکہ سمندری جہاز مہینے میں ایک مرتبہ بمبئی سے جدّہ جاتا تھا اس لئے وقت نہ ہونے کی وجہ سے ایک اتالیق ماسٹر فاروقی صاحب کے ہمراہ معہ ایک خاندانی نوکر سکندر نامی کے، تینوں بچوں کو (والد صاحب محمد شفیع عمر ۱۱ سال، بڑے چچا محمد یمین عمر ۹ سال اور چھوٹے چچا محمد رفیع عمر ۵ سال) علی گڑھ بھیجا گیا۔ والد صاحب قبلہ فرماتے تھے کہ جب وہ یونیورسٹی اسکول کے ہیڈ ماسٹر مسٹر ریس Mr.Rees (جن کو بچے نہایت احترام سے "ریچھ صاحب" کہہ کر پکارتے تھے) کے سامنے داخلے کے لئے پیش ہوئے تو کوئی دقت نہ ہوئی، جب ان کے چھوٹے بھائی یامین صاحب پیش ہوئے تو کچھ ہچکچاہٹ کے ساتھ کہ عمر کم ہے، داخلے کی منظوری ہوئی۔ مگر جب سب سے چھوٹے بھائی رفیع صاحب عمر ۵ سال
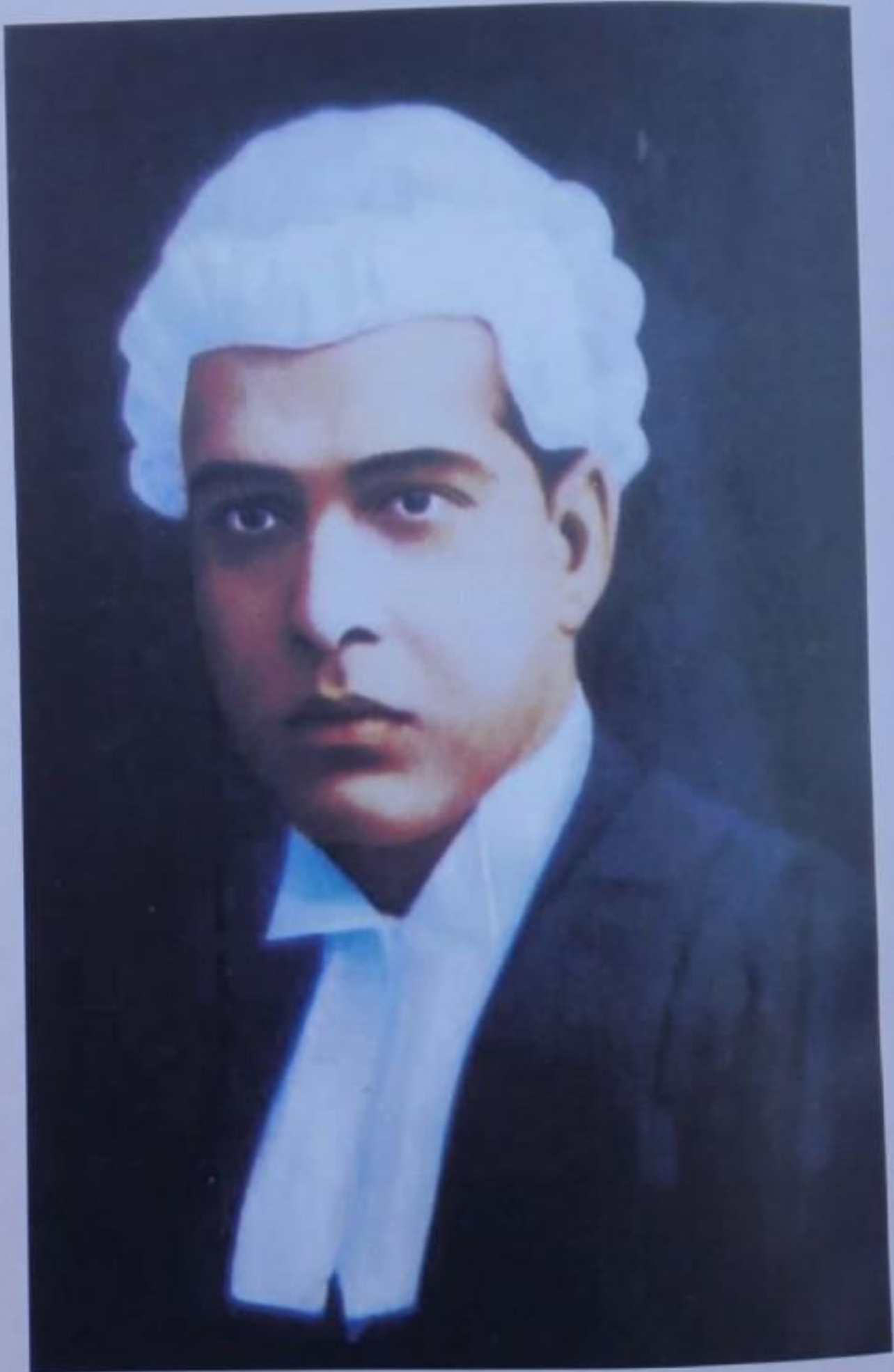
پروفیسر ایس ایم شفیع

(والد ماجد بریگیڈیر اقبال شفیع)

بی اے (علیگ) بی ایس سی (لندن سکول آف اکنامکس)

بار ایٹ لاء (مڈل ٹمپل۔ لندن)

بشکریہ

جناب کامران مقصود رضوی صاحب (راولپنڈی)

ذخیرہ کتب

محمد احمد ترازی (کراچی)

سامنے آئے تو مسٹر ریس نے یہ کہہ کر کہ ''گود کے بچوں کو اسکول داخل نہیں کیا جاتا'
(I cannot admit babies in arms!) داخلے سے صاف انکار کر دیا۔ غرض کہ
مسئلہ کھڑا ہو گیا۔ ماسٹر فاروقی صاحب نے دادا جان کو بمبئی تار دیا کہ فوراً آئیں' انہوں نے
اگلے مہینے کے جہاز کا بندوبست کیا اور فوراً علی گڑھ پہنچ گئے۔ پتا چلا کہ ہیڈ ماسٹر ریس بالکل
نہ مانیں گے صرف اگر نواب وقار الملک صاحب اجازت دیں۔ دادا جان قبلہ
تینوں بچوں کو لے کر نواب صاحب کی خدمت میں حاضر ہوئے' والد صاحب قبلہ بتاتے تھے
کہ نواب صاحب کچھ کاغذات دیکھ رہے تھے تو وہیں ان سب کو بلا لیا' خندہ پیشانی سے ملے
اور سب وہیں فرش پر بیٹھ گئے۔ جب دادا جان نے فرمایا کہ وہ ملک سے باہر سرکاری نوکری
پر جا رہے ہیں اور جدّہ میں بچوں کی تعلیم کا خاطر خواہ بندوبست نہیں اور یہ کہ ریس
صاحب' رفیع میاں (عمر ۵ سال) کے داخلے پر راضی نہیں تو نواب صاحب نے کچھ سوچا
اور پھر فرمایا ''ڈاکٹر صاحب' ہیڈ ماسٹر درست کہہ رہا ہے' مگر میں آپ کی مجبوری بھی سمجھ رہا
ہوں۔ اگر یہ ادارہ اس آڑے وقت میں قوم کے بچوں کے کام نہ آیا تو اس کا کیا فائدہ؟ میں
ہیڈ ماسٹر کو خط لکھے دیتا ہوں کہ میری ذمہ داری پر سب سے چھوٹے بھائی کو بھی داخل کر لیا
جائے مگر جو بھی شرائط ہیڈ ماسٹر صاحب لگانا چاہیں وہ آپ کو منظور کرنی ہوں گی۔'' اللہ اللہ کیا
سلیمانی فیصلہ کیا کہ اصول بھی نہ ٹوٹا' ہیڈ ماسٹر کی بات بھی درست مانی گئی اور بچوں کی تعلیم کا
بھی خاطر خواہ بندوبست ہو گیا۔ یہ وہی لوگ تھے جنہوں نے علی گڑھ کو ایک قومی ادارہ بنایا۔

دادا جان خط لے کر مسٹر ریس کے پاس گئے تو انہوں نے فرمایا کہ اگر نواب
صاحب ذمہ داری لے رہے ہیں تو مجھے کوئی اعتراض نہیں۔ لیکن میری شرائط یہ ہیں کہ ایک تو
خاندانی نوکر ساتھ رہے' دوسرے اتنے روپے جمع کرائے جائیں کہ اگر کبھی اچانک بچوں کو

جدّہ بھیجنا پڑے تو دیر اور دقت نہ ہو اور یہ کہ اسکول کے اساتذہ میں سے ایک استاد بطور اتالیق مقرر کیے جائیں کہ جن کی سرپرستی میں یہ بچے رہیں۔

چنانچہ اب اتالیق کی تلاش شروع ہوئی۔ معلوم ہوا کہ ''ماریسن کورٹ'' میں (سر تھیوڈور ماریسن یعنی سابق پرنسپل کے نام پر کہ جہاں اسکول تھا) وارڈن جناب مصطفی شاہ صاحب نہایت شریف اور ذمہ دار استاد ہیں اگر وہ یہ ذمہ داری اٹھالیں تو شرائط پوری ہوتی ہیں۔ دادا جان قبلہ بچوں کو لیکر شاہ صاحب کے پاس پہنچے اور اپنی مجبوری بیان کی تو شاہ صاحب بلا تامل راضی ہو گئے اور کہا کہ میرے کوئی بچے نہیں میں انہیں کو اپنے بچوں کی طرح سنبھالوں گا۔ اب دادا جان سے چوک یہ ہوئی کہ شکریہ ادا کرنے کے بعد چلنے سے پہلے یہ کہہ دیا کہ ''قبلہ آپ کیا معاوضہ پسند فرمائیں گے؟'' یہ بات سنی تو شاہ صاحب نے دوٹوک فرمایا کہ ''ڈاکٹر صاحب میں نے آپ کی مجبوری کو دیکھتے ہوئے بچوں کی خاطر آپ کی مدد کے لئے یہ ذمہ داری قبول کی ہے۔ اگر معاوضہ کی بات ہے تو کسی اور اتالیق کو تلاش کرلیں''۔!

اللہ اللہ یہ وہ کردار تھا کہ جس نے استاد اور شاگرد کو محبت کے رشتے میں جوڑا اور علی گڑھ کو علی گڑھ بنایا۔ غرض کہ دادا جان نے شاہ صاحب سے معافی مانگی اور یوں معاملہ طے پایا اور یہ بچے ایم۔اے۔او۔ کالج میں ۱۹۰۹ء میں داخل ہوئے اور اس طرح آگے چل کر بڑے بھائی نے بی۔اے کے بعد ولائت سے اپنی ڈگریاں لیں، اور پھر علی گڑھ ہی میں پروفیسر ہوئے۔ منجھلے بھائی نے بھی علی گڑھ اور پھر ولائت میں پڑھا اور ریلوے کے ڈویژنل انجینیر ہوئے اور چھوٹے میاں کہ جن کی وجہ سے یہ سب ہنگامہ ہوا آگے چل کر ولائت سے ڈاکٹر ہوئے اور W.H.O میں پاکستان کی نمائندگی بیرون ممالک میں بھی کی۔ دادا جان قبلہ آگے چل کر تہران میں برٹش قونصل بھی رہے اور ملک واپس آکر دہرہ دون میں کوٹھی بنا کر

بیگم خدیجہ شفیع

والدہ ماجدہ بریگیڈیئر اقبال شفیع (جو نادار بچوں کے لئے مفت سکول چلاتی تھیں)

بشکریہ

جناب کامران مقصود رضوی صاحب (راولپنڈی)

ذخیرہ کتب

محمد احمد ترازی (کراچی)

بس گئے اور ۱۹۳۵ء میں خالق حقیقی سے جا ملے۔ دیکھئے کہ نواب وقار الملک قبلہ کے بروقت صحیح فیصلے سے کیا دور رس نتائج مرتب ہوئے۔ والد صاحب قبلہ علی گڑھ میں کیا داخل ہوئے کہ وہیں کے ہو کر رہے اور ۵۰ سال تک علی گڑھ سے منسلک رہے۔ پہلے بی اے کیا پھر لندن اسکول آف اکنامکس سے ڈگریاں لیں' مڈل ٹمپل سے بیرسٹری پاس کر کے واپس علیگڑھ آئے اور اکنامکس میں لیکچرار لگ گئے اور یہ سلسلہ جو ۱۹۰۹ء میں شروع ہوا ۱۹۵۸ء میں اس وقت تک چلا کہ جب وہ ریٹائر ہو کر علیگڑھ سے پاکستان تشریف لے آئے۔

یہاں ایک دو دلچسپ واقعات کا بیان مناسب ہوگا' کہ جس سے علی گڑھ اور فرزندان علی گڑھ کے کردار کا پتا چلتا ہے۔

علی گڑھ میں طالبعلمی کے زمانے میں (۱۹۰۹ء تا ۱۹۲۰) والد صاحب یونیورسٹی ہاکی ٹیم کے دو سال کپتان رہے' اور اپنی کپتانی میں سر آغا خان گولڈ کپ' سندھیا گولڈ کپ' رام لال کپ اور دوسرے متعدد ٹورنامنٹ جیتے جس کا فخریہ بیان ہمیشہ فرماتے تھے۔ ہم عصروں میں نواب حمید اللہ خان آف بھوپال' فتح محمد خان آف شیوا' حیدرآباد دکن کے مصطفٰے بیگ' عبداللہ پاشا' بریلی کے کبیر حسین خان اور اس کے علاوہ پنجاب کے عمر حیات ملک اور لکھنؤ کاکوری کے منشی احتشام علی اور منشی احترام علی جیسے دوست تھے' کہ جن کا تذکرہ نہایت محبت سے مرتے دم تک کرتے رہے۔ ان میں بہت سے دوستوں کے بچے علی گڑھ میں آکر پڑھتے رہے جہاں والد صاحب غیر رسمی اتالیق ہوتے تھے اور یہ سب اکثر ہمارے گھر آکر اپنا گھر سمجھ کر وقت گزارتے تھے کہ یہ انکا حق تھا۔

والد صاحب قبلہ کو ہندوستان میں اور نوکریوں کی بھی پیشکش ہوئی مگر انہوں نے علی گڑھ نہ چھوڑا۔ ایک دفعہ کا ذکر سنئے۔ ہوا یوں کہ سر تھیوڈور گریگری جو لندن اسکول آف

اکنامکس میں ان کے استادِ خاص تھے اور اکثر گھر بلا کر وہ اور ان کی بیگم چائے پلایا کرتے تھے۔ وہ وائسرائے ہند کی ایگزیکٹو کونسل کے رکن اور اکنامک ایڈوائزر ٹو گورنمنٹ آف انڈیا کے عہدے پر فائض ہو کر دہلی تعینات ہو گئے۔ یہ غالباً ۱۹۳۴ء کا واقعہ ہے۔ دہلی آ کر انہوں نے والد صاحب کو خط لکھا کہ وہ بہت خوش ہوں گے اگر والد صاحب حکومت ہند کی نوکری قبول کریں اور ان کے ساتھ دہلی میں کام کریں اور یہ کہ گھر اور موٹر وغیرہ کا سب بندوبست ہو جائے گا۔ والد صاحب کہ جن کے لئے علیگڑھ یونیورسٹی کی لیکچراری ملازمت نہ تھی بلکہ دل کا درد تھا' کافی پریشان ہوئے اور ڈاکٹر سر ضیاء الدین صاحب وائس چانسلر کے پاس گئے اور عرض کی کہ میرا بہت مہربان پروفیسر مجھے دہلی ملازمت کے لئے بلا رہا ہے آپ کسی طرح میری خلاصی کرائیں۔ ڈاکٹر صاحب قبلہ کہ دنیا دیکھے ہوئے تھے کہنے لگے کہ آپ سر تھیوڈور کو خط لکھیں کہ میرے وائس چانسلر اجازت نہیں دے رہے اور وہ خود آپ کے پاس آ کر اس سلسلے میں دہلی میں ملاقات کریں گے۔ قصہ مختصر یوں کہ ڈاکٹر صاحب نے جو اکثر دہلی جاتے رہتے تھے وہاں جا کر سر تھیوڈور کو علیگڑھ آنے کی سرکاری دعوت دی۔ والد صاحب نے اپنے خط میں یہ بھی لکھا تھا کہ آپ جب بھی علی گڑھ تشریف لائیں میرے غریب خانے پر قیام فرمائیں عزت افزائی ہو گی۔ مجھے بھی یاد ہے سر تھیوڈور علی گڑھ آئے اور ہمارے گھر ایک دن رات قیام فرمایا گھر پر رات کا کھانا ہوا' ہم بچوں کو بھی چند منٹ کے لئے ملوایا گیا۔ سر تھیوڈور کے علاوہ سر راس اور سر ضیاء الدین اور چند اور پروفیسر صاحبان بھی تھے۔ بہر حال والد صاحب ہمیں اکثر سنایا کرتے تھے کہ سر تھیوڈور نے سر راس مسعود اور ڈاکٹر ضیاء الدین صاحب سے شکایتاً فرمایا کہ ''ایک طرف تو آپ کہتے ہیں کہ حکومت ہند مسلمانوں کو اچھی نوکریاں نہیں دیتی اور دوسری طرف میں اپنے عزیز شاگرد کو حکومت

''شفیع ہاؤس'' علی گڑھ میں ہمارا گھر جو والد صاحب قبلہ نے یونیورسٹی کو تحفۃً پیش کر دیا۔ اس کے سامنے والی سڑک کا نام بھی ''پروفیسر شفیع روڈ'' ہے

دائیں سے بائیں عالی سائرہ، مہناز، اقبال شفیع، مریم بی بی اور ماجدہ اقبال (۱۹۹۸ء)

ہند میں اپنے پاس ایک خاص ملازمت کے لئے بلا رہا ہوں اور آپ اجازت نہیں دیتے۔''

ڈاکٹر سر ضیاء الدین صاحب نے اپنے مخصوص انداز میں مسکرا کر فرمایا کہ پہلے آپ میرا قصہ سن لیں، اس نوجوان لیکچرار کی بات بعد میں کریں گے۔ کہنے لگے کہ جب میں (غالباً ۱۸۹۵ء میں) کلکتہ یونیورسٹی سے حساب میں نہ صرف کامیاب ہوا، بلکہ پورے ہندوستان میں اول رہا تو اس وقت کے یو۔پی کے گورنر صاحب نے مجھے ایک تہنیت کا خط لکھا کہ میں بہت خوش ہوں کہ میرے صوبے کا طالبعلم تمام ہندوستان میں اول آیا ہے بلکہ ریکارڈ قائم کیا ہے اور تم فوراً آ کر ملو اور حکومت کی نوکری شروع کر دو جو میں نے تمہارے لئے منتخب کی ہے۔ ڈاکٹر صاحب فرماتے ہیں کہ یہ خط لے کر علی گڑھ سر سیدؒ ہاؤس میں سر سیدؒ کے پاس حاضر ہوا۔ سر سیدؒ ایک تخت پر بیٹھے ہوئے کام کر رہے تھے۔ تھوڑی دیر کے بعد سر اٹھایا اور پوچھا کیا بات ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے خوشی خوشی وہ خط سر سیدؒ کی خدمت میں پیش کیا کہ اب مجھے شاباش ملے گی۔ فرماتے ہیں کہ سر سیدؒ خط پڑھتے جاتے تھے اور چہرے پر غصے کے آثار تھے کہ بڑھتے چلے جاتے تھے۔ اور آخر میں مجھ سے غصے میں فرمایا کہ ''جاؤ حکومت کی نوکری کرو اور اس کالج کو بند کر کے اس کے اوپر تالہ لگا دو۔'' ڈاکٹر صاحب ظاہر ہے، بہت پریشان ہوئے اور ادب سے ایک طرف کھڑے رہے اور کچھ دیر کے بعد جب سر سیدؒ کا غصہ کچھ کم ہوا تو ڈرتے ڈرتے عرض کی کہ ''حضور میرے واسطے کیا حکم ہے'' اس پر سر سیدؒ نے سر اٹھا کر دیکھا اور صرف اتنا کہا ''جاؤ، بچوں کو حساب پڑھاؤ''۔ ڈاکٹر صاحب نے فرمایا کہ ''جناب اس حکم کی تعمیل میں پچھلے چالیس سال سے بچوں کو حساب پڑھا رہا ہوں تو یہ نوجوان بھی اگلے چالیس سال یہاں ہی بچوں کو اکنامکس پڑھائے گا''۔ غرضیکہ اس طرح بات صاف ہوئی اور ابا جان کی حکومت ہند کی ملازمت سے جان چھوٹی۔ یہ وہ لگن، دل کا درد

اور قوم کا غم تھا کہ جس نے قوم کو اس قابل بنایا کہ وہ آگے چل کر پاکستان کے قیام کیلئے جدوجہد کرے۔ والد صاحب جب بھی یہ قصہ سناتے تھے تو علی گڑھ سے محبت اور اپنی وابستگی کے جوش سے اُن کی آنکھوں میں آنسو آجاتے تھے۔

یہاں میں چاہوں گا کہ اپنے مشاہدے سے دو تین واقعات آپ کی خدمت میں پیش کروں کہ اصلی خوشی اور سکونِ قلب کس طرح میسر ہوتا ہے۔

ہمارے دادا جان قبلہ (خان بہادر ڈاکٹر عبدالرحمٰن) طبی ڈاکٹر تھے' انیسویں صدی کے اختتام اور بیسویں صدی کے شروع کے عرصہ میں مدتوں ہندوستان کے صوبے یو۔پی میں کئی مقامات پر سول سرجن رہے۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ اول تو مسلمان ڈاکٹر ہوتے ہی بہت کم تھے اور ان میں سے شاذونادر ہی کسی کو وزارت خارجہ میں لیا جاتا تھا۔ ۱۹۰۹ء میں ہمارے دادا جان کو انگریزی حکومت نے وزارت خارجہ میں لے کر پانچ سال کے لئے جدہ میں تعینات کیا جہاں وہ شفاخانہ حجاز (اس وقت کی حجاز ڈسپنسری) سے بھی منسلک رہے اور پھر ترقی دے کر پانچ سال کے لئے تہران میں مقرر کیا جہاں سے وہ بہت عزت کے ساتھ پنشن لے کے دہرہ دون آگئے اور گھر بنا کر رہنے لگے اور وہاں ہی ۱۹۳۵ء میں انتقال فرمایا۔ دادا جان قبلہ نے کل تین شادیاں کیں مگر ایک وقت میں ایک ہی بیگم رہیں۔ جب پہلی بیگم کا انتقال ہوا تو پھر دوسری شادی کی اور دوسری بیگم کی رحلت کے بعد تیسری شادی کی۔ ۱۹۳۵ء میں جب دادا جان کو احساس ہوا کہ اب رحلت کا وقت قریب ہے تو تینوں بیگمات کے کُل ۱۵ بچوں کو دہرہ دون بلایا اور فرمایا "دیکھو میرا وقت اب آگیا ہے' تم بچوں میں سب سے بڑا بھائی شفیع (میرے والد صاحب قبلہ) ہے' وہ ویسے بھی ولایت سے بیرسٹری کر کے آیا ہے۔ پس جائیداد کے متعلق وہ جو بھی فیصلہ کرے تم سب کو منظور ہونا چاہیئے"۔ اس پر تمام
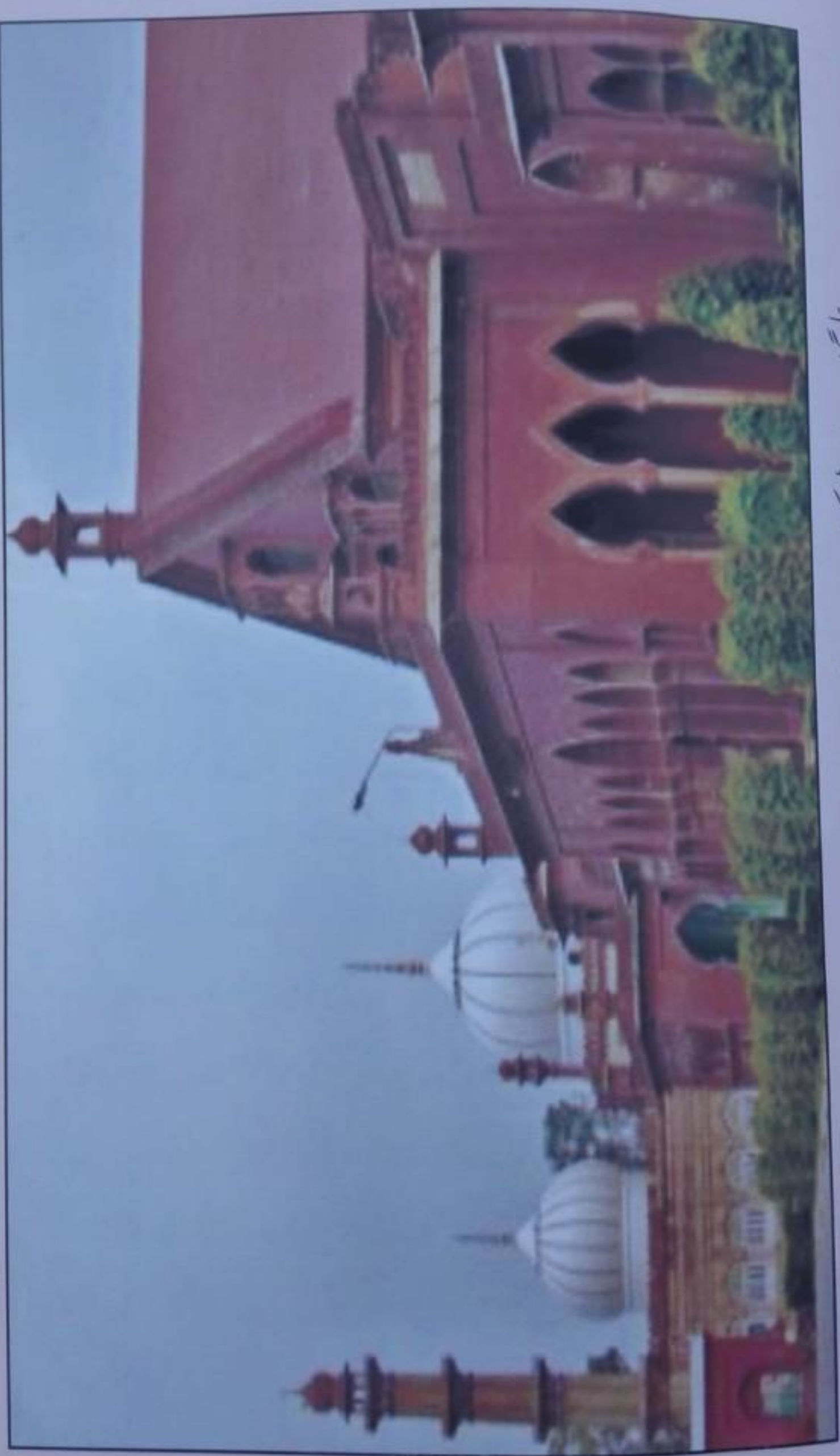
علی گڑھ یونیورسٹی کی مسجد اور اسٹریچی ہال جہاں ہم نے قائداعظم کی تقاریر سنیں

بچوں نے رضامندی ظاہر کی اور دادا جان قبلہ یہ وصیت کر کے اللہ کو پیارے ہو گئے۔

اب دیکھئے کہ قبلہ والد صاحب نے کیا فیصلہ کیا۔ انہوں نے فرمایا: میں اور میرے دونوں سگے بھائی تو علیگڑھ سے پڑھ کر ولایت سے بھی ڈگریاں لے آئے ہیں اور اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کی وجہ سے بفضلِ خدا اچھی نوکریوں پر ہیں، ہم تینوں کو (پہلی بیگم کے بچے) کسی قسم کی جائیداد نہیں چاہیے۔ اب جو دوسری بیگم کے بچے ہیں ان کو جالندھر کی تمام آبائی جائیداد یں، زمین، گھر وغیرہ دے دیئے جائیں اور تیسری بیگم اور ان کے بچوں کو دہرہ دون کی کوٹھی، باغ، زیور اور نقدی کہ وہ ابھی چھوٹے ہیں۔ غرضیکہ یہ پیچیدہ مسئلہ بڑی آسانی سے بخیر و خوبی طے ہو گیا اور نتیجہ یہ ہے کہ ابھی تک قبلہ والد صاحب کے تمام بھائی بہنوں کی اولادیں ان کو بہت عزت و احترام سے یاد کرتے ہیں کہ انہوں نے خود اور اپنے دونوں سگے بھائیوں کے لئے کچھ نہ لیا، قیمتی جائیدادیں انصاف کے ساتھ دوسرے بھائیوں اور اپنی سوتیلی ماں کو دے دیں۔

اب ذرا ہمارے قبلہ والد صاحب کا اپنی جائیداد کے متعلق بھی فیصلہ دیکھئے۔ وہ کالج اور علی گڑھ یونیورسٹی سے پورے ۵۰ سال (۱۹۰۹-۱۹۵۸) منسلک رہے اور وہاں ہی یونیورسٹی میں ایک بہت خوبصورت کوٹھی انگریز فرم Ford and MacDonald سے بنوائی جس نے نئی دہلی میں وائسرائے کی سرکاری رہائش گاہ Viceregal Lodge تعمیر کی تھی۔ جب ۱۹۵۸ء میں پاکستان آنے لگے تو اپنی تمام قیمتی اور خوبصورت مجلد کتابیں (لندن اسکول آف اکنامکس اور مڈل ٹیمپل کی کتابیں) اور باقی ذاتی لائبریری یونیورسٹی کی لٹن لائبریری (موجودہ ''مولانا آزاد لائبریری'') کے سپرد کر دیں۔ تمام فرنیچر، قالین، حتیٰ کہ انگلستان کی کراکری اور چاندی کے چھری کانٹے وغیرہ سب اپنے دوستوں میں بانٹ دیئے اور وہ خوبصورت کوٹھی یونیورسٹی کے سپرد کر دی جہاں اب بھی ''شفیع ہاؤس'' یونیورسٹی

کے پروفیسروں کی رہائش گاہ ہے۔ ان کے اعزار میں سامنے والی سڑک کا نام یونیورسٹی نے ''پروفیسر شفیع روڈ'' رکھ دیا ہے۔ یہ سب کچھ کر کے ۱۹۵۸ء میں قبلہ والد صاحب اور محترمہ والدہ صاحبہ ایک ایک سوٹ کیس لے کر لاہور تشریف لے آئے کہ اب پاکستان میں نئی زندگی کی بنیاد ڈالیں گے۔ مزید کہ جالندھر' دہرہ دون یا علی گڑھ کی جائیدادوں کے عوض ایک انچ زمین یا جگہ بھی پاکستان سے نہ لی کہ پاکستان مل گیا تو ہمیں اور کیا چاہیے۔

میں فوج سے پنشن لینے کے بعد خدا کے فضل سے اب تک چھ دفعہ علی گڑھ جا چکا ہوں۔ وہاں کے لوگوں میں قبلہ والد صاحب کی جو عزت اب بھی ہے وہ دیکھنے سے تعلق رکھتی ہے اور لوگ ان کو Legendary Professor کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ ان کی تصاویر اکثر دفاتر میں لگی ہوئی ہیں جہاں وہ کام کیا کرتے تھے۔ اُدھر والدہ صاحبہ مرحومہ کی سادگی کا حال سنیئے۔ اول تو گھر سے کبھی کوئی سائل خالی ہاتھ نہ گیا' دوسرے' یونیورسٹی کے طلباء کے لئے گھر کا دروازہ ہمیشہ کھلا رہتا تھا۔ فرماتی تھیں کہ یہ اپنے گھروں سے دور آئے ہوئے بچے بھی تو ہمارے بچے ہیں اور ان کی دیکھ بھال ہمارا فرض ہے اور ان کا حق۔ بچوں کے والدین جب کبھی انہیں ملنے آتے تو ان کے لئے بھی ہمارا گھر حاضر رہتا تھا کہ آرام سے ٹھہریں اور اپنے بچوں سے اطمینان سے ملیں۔ اس کے علاوہ میں نے خود دیکھا کبھی کبھی ایسا ہوتا تھا کوئی ضرورت مند آیا تو والدہ صاحبہ نے الماری کھول کر ابا جان قبلہ کا کوئی سویٹر یا گرم کوٹ یا قمیض پاجامہ اس کو دے دیا۔ ابا جان کبھی دبی زبان سے پوچھتے ''بیگم صاحبہ میرا وہ کوٹ نہیں مل رہا'' تو والدہ صاحبہ مسکرا کر مرزا بیدلؔ کے شعر

حرص قانع نیست بیدلؔ ورنہ اسبابِ جہاں

اُنچہ ما درکار داریم اکثرے درکار نیست

کا صرف آخری حصہ کہہ دیتی تھیں: ''اکثرے در کار نیست'' اور ابا جان سمجھ جاتے اور مسکرا کر چپ ہو جاتے۔ میں سمجھتا ہوں اللہ تعالیٰ نے ان دونوں بزرگوں کو دلی خوشی اطمینان اور سکون کی دولت سے مالا مال کیا ہوا تھا کہ ان دونوں نے بجائے اپنی زندگی کو محور بنانے کے دوسروں کی مدد کرنا اور ان کے دکھ درد میں شریک ہونا زیادہ اہم اور مقدم سمجھا ہوا تھا۔

بہر حال بات تو قناعت اور سادگی کی ہو رہی تھی۔ میری نظر میں قناعت کا مطلب ہر گز یہ نہیں ہے کہ انسان اپنی جائز دنیاوی ضروریات کو پورا کرنے کے لئے جدو جہد نہ کرے۔ جدو جہد تو انسان بلکہ معاشرے اور ملک اور قوم کی بقا کیلئے از حد ضروری ہے۔ ہاں دیکھنا یہ ہے کہ اس جدو جہد کا مقصد جائز و ناجائز ذریعوں سے صرف اپنے لئے حصول دولت ہے یا اسلامی اقدار اور انسانیت کے دائرے میں رہتے ہوئے رزق حلال کی کمائی ہے اور پھر اس کا مصرف اپنی ذات کے لئے جائز و ناجائز خواہشات کا پورا کرنا ہے یا کہ اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کر کے اور اسراف سے بچ کر اللہ تعالیٰ کی مخلوق کی بھلائی ہے؟

علم و عمل کی تگ و دو سے سکون اور خوشی اور ساتھ ہی دوسروں کی بھلائی کی راہ ہموار کرنے کی ایک روشن مثال جو میرے بچپن میں اپنے گھر میں محترمہ والدہ صاحبہ نے قائم کی تھی یہاں پیش کرتا ہوں۔ والد صاحب قبلہ تو صبح سے شام تک بلکہ رات کو بھی اپنے یونیورسٹی کے کاموں میں مصروف رہتے تھے کہ پڑھائی اور کھیلوں اور تنظیم کے ذریعے اپنے شاگردوں کی زندگیاں سنوارنا قبلہ والد صاحب کا نہ صرف دل کا درد تھا بلکہ ان کی زندگی کا مقصد یا ماحصل تھا۔ محترمہ والدہ صاحبہ نے گھر کے پیچھے چبوترے پر بچوں کے ایک چھوٹے سے اسکول کا سلسلہ شروع کیا ہوا تھا جہاں غریب ملازموں کے بچوں کو تعلیم دی جاتی تھی۔ انہیں نہایت واضح ہدایت تھی کہ تمام بچے بچیاں نہا دھو کر صاف ستھرے ہو کر

آئیں۔ پڑھائی نہ صرف بالکل مفت تھی بلکہ تختیاں، قلم، پنسلیں، کاپیاں، ربڑ، قاعدے اور قرآن شریف کے سیپارے اورلڑکیوں کے سلائی کے دھاگے وغیرہ سب والدہ صاحبہ خود فراہم کر کے دیتی تھیں۔اس کے علاوہ وقفے کے دوران بچوں کوایک گلاس شربت اور کچھ موسم کا پھل بھی ملتا تھا۔ میں ۱۹۴۶ء میں انڈین آرمی کے لئے چن لیا گیا تھا۔ ۱۹۴۷ء کے جون میں قیام پاکستان سے پہلے گرمیوں کی چھٹیوں میں پہلی دفعہ دہرہ دون اکیڈمی سے گھر آنے لگا تو میں نے خط لکھ کر محترمہ والدہ صاحبہ سے پوچھا کہ آپ کے لئے کیالاؤں۔فوراً خط کا جواب آیا کہ تم ''میرے بچوں'' کے لئے کاپیاں پنسلیں اور ربڑ لانا اور سب سے زیادہ ضروری کچھ ٹوکرے دہرہ دون کی مشہور لیچی کے ضرور لاؤ ان بچوں نے کبھی لیچیاں نہیں کھائی ہیں!

میں واپس دہرہ دون چلا گیا اور پھر پاکستان بننے کے بعد وہیں سے اکتوبر ۱۹۴۷ء میں پاکستان پہنچ کر فوجی زندگی میں مصروف ہوگیا۔ زمانہ گزرتا گیا' فوج اور وزارتِ خارجہ دونوں سے فارغ ہوکر جب آغا خان فاؤنڈیشن میں تھا تو تقریباً چالیس سال کے بعد پہلی مرتبہ پھر علی گڑھ جانے کا موقع اللہ تعالی نے فراہم کیا: وہاں کیا کیا دیکھا' کیا کیا یادیں تازہ ہوئیں' کن کن لوگوں سے ملاقاتیں ہوئیں یہ تو ایک لمبی داستان ہے مگر ایک واقعہ سنیے۔ یونیورسٹی کے مہمان خانے میں شام کوکہیں سے واپس آیا تو بیرے نے کہا ''ایک صاحب بہت دیر سے آپ کے انتظار میں بیٹھے ہوئے ہیں آپ سے ملنا چاہتے ہیں مگر نام نہیں بتاتے کہتے ہیں کہ میں خود ہی بتاؤں گا''۔ میں نے کہا ''فوراً یہاں لے آؤ ضرور کوئی پرانے دوست ہوں گے''۔

جب تقریباً ۵۰ سال کی عمر والے یہ حضرت کمرے میں داخل ہوئے تو قبل اسکے کہ میں انکو پہچانوں ایک چیخ مار کر یکدم میری ٹانگوں سے لپٹ گئے اور رو رو کر اپنا برا

حال کرلیا۔ بڑی مشکل سے میں نے انکو سنبھالا کرسی پر بٹھایا اور پانی پلایا تو ہچکیوں کے درمیان کہنے لگے کہ ''آپ مجھے کیسے پہچانیں گے میں تو آپکی دھوبن کلثوم کا بیٹا کلّو ہوں جو آپ کی امی جان کے چبوترے پر قاعدہ پڑھا کرتا تھا''۔ جب پانی پیا اور طبیعت کچھ بحال ہوئی تو بتایا قبلہ ابا جان نے بعد میں اسکول میں داخل کروادیا تھا اور پھر ڈیوٹی سوسائٹی (انجمن الفرض) سے وظیفہ دلوا کر بی۔اے پاس کروادیا تھا اور اب اپنی محنت اور ذہانت کے سبب حکومتِ ہند میں محکمہ زراعت میں ڈپٹی سیکرٹری ہیں اور نام محمد حبیب خان ہے! پھر بتایا جب سے پتا چلا ہے آپ یہاں آئے ہوئے ہیں تو والدہ صاحبہ ضد کررہی ہیں وہ آپ کو دیکھنا چاہتی ہیں اور یہ کہ آپ کو گھر لے آؤں۔ تقریباً رات ہو چکی تھی ہم دونوں کلثوم بیگم کے گھر پہنچے۔ وہ اب کافی عمر رسیدہ ہو چکی تھیں، مجھے دیکھا تو فوراً گلے لگایا اور رو رو کر محترمہ والدہ صاحبہ کو یاد کرتی رہیں۔ باربار کہتیں۔ ''اقبال میاں تمہاری امی تو جنتی بی بی ہیں کہ میرے کلّو کی زندگی سنوار گئیں۔ ہم تو ہر وقت ان کے لئے دُعا کرتے ہیں''۔

بھلا بتایئے! جو ننھا سا پودا ہماری والدہ صاحبہ نے چالیس سال پہلے لگایا تھا وہ کہاں سے کہاں پہنچا! اس کے علاوہ محمد حبیب خان نے اور بچوں کا بھی بتایا۔ کوئی اسکول ماسٹر بنے ہوئے ہیں کچھ کلرکی کررہے ہیں، بہرحال بڑے ہو کر تعلیم سے فائدہ اٹھایا اور اپنی زندگیوں کو سنوارا۔ کافی دیر تک ہم بیٹھے رہے، محلے کے دوسرے لوگ بھی آتے گئے۔ کلثوم بیگم نے چائے اور سموسوں سے خاطر کی۔ باقاعدہ دادی بن چکی تھیں، اپنے پوتے پوتیوں سے ملوایا، میں نے بچوں کی مٹھائی کے لئے کچھ پیسے دیئے جو بڑی

مشکل سے انہوں نے قبول کیئے اور کہا اگلے دن آ کر کھانا کھاؤں گا مگر افسوس کہ بوجہ مصروفیت میں یہ سعادت حاصل نہ کر سکا۔

مقصد اس واقعے کو بیان کرنے کا یہ ہے کہ علم کے ساتھ عمل کے ذریعے دوسروں کی خدمت کرنے کے لئے کروڑ پتی ہونا ضروری نہیں۔ یہ ایک سوچ کی طرز ہے کہ ہر وقت کسی نہ کسی کی بہتری کے لئے کام کیا جا سکتا ہے اور اس تگ و دو اور عمل ہی میں دلی سکون اور خوشی کا راز پنہاں ہے۔ عمل کے باب میں جو ایک بات اور سامنے آتی ہے وہ یہ کہ ہمارا وقت اور ہماری زندگی محدود ہے۔ اس لئے جس نیک کام کا بھی ارادہ ہو اس میں لیت ولعل نہ کی جائے بلکہ اللہ کا نام لے کر شروع کر دینا چاہیے کہ شروع ہو گا تو انشاءاللہ اختتام پر پہنچے گا۔ ورنہ دیکھا گیا ہے کہ وقت گذر جاتا ہے اور بعد میں انسان کفِ افسوس ملتا رہ جاتا ہے کہ وقت نکل گیا۔ بعض اوقات ہم اپنے بچپن اور اپنی جوانی کو گنوا دیتے ہیں اور مستقبل میں رہتے ہیں کہ جب فرصت ملے گی تو اس وقت یہ کام کر لیں گے۔ دیکھا گیا ہے کہ پھر وقت ہاتھ سے نکل جاتا ہے۔ کہ فرصت ملتی ہی نہیں اور وقت گزر جاتا ہے، علامہؒ نے کیا خوب کہا ہے کہ:

میسر آتی ہے فرصت فقط غلاموں کو
نہیں ہے بندۂ حُر کے لیے جہاں میں فراغ!

علامہ اقبال

حرفِ آغاز

جب سے ہوش سنبھالا، میری زندگی کا دور کچھ اس طرح گزرا۔ ۱۹۰۹ء سے ۱۹۲۲ء تک علیگڑھ اسکول، کالج اور یونیورسٹی میں بسلسلۂ تعلیم ۱۹۲۲ء سے ۱۹۲۶ء تک لندن سکول آف اکنامکس اور بارایٹ لاء، مڈل ٹمپل لندن ۱۹۲۶ء سے ۱۹۵۷ء علیگڑھ یونیورسٹی میں بسلسلۂ ملازمت، ۱۹۵۹ء سے ۱۹۷۲ء تک جامعہ ملیہ کالج کراچی میں بسلسلہ ملازمت اور اب جولائی ۱۹۷۲ء سے ایبٹ آباد میں بفضلِ خدا گوشہ نشینی کی پُرسکون زندگی ہے۔

میرے اکثر احباب نے مشورہ دیا کہ میں اس مدت کے حالات قلم بند کروں، میں نے سوچا کہ اس عرصہ کی تاریخ تو بہت کچھ لکھی جا چکی ہے۔ نیز اسی زمانہ کی مشہور ہستیوں کی سوانح عمریاں بھی موجود ہیں۔ البتہ کچھ ایسے واقعات لکھے جا سکتے ہیں جو اس طویل عرصہ میں پیش آئے۔ جن کی روشنی میں اس زمانہ کے حالات سامنے آئیں گے۔ اور ممکن ہے کہ وہ سبق آموز بھی ہوں۔

یہ کوشش اُسی جذبہ کے پیشِ نظر ہے۔

ایس۔ ایم۔ شفیع

علی گڑھ اسکول میں داخلہ

۱۹۰۹ء میں میرے والد صاحب (خان بہادر ڈاکٹر ایس عبدالرحمٰن صاحب) کا تقرر جدّہ (عرب) میں بحیثیت برٹش وائس کونسل ہوا۔ اور اس کے ساتھ ہم تینوں بھائیوں کی تعلیم کا مسئلہ بھی پیدا ہوا چند دوستوں کے مشورہ سے والد صاحب نے یہ فیصلہ کیا کہ ہم کو علی گڑھ اسکول میں داخل کروایا جائے۔ والد صاحب کو جلدی تھی اس لئے وہ جدّہ جانے کیلئے بمبئی روانہ ہوگئے اور اپنے ایک دوست سے فرما گئے کہ علی گڑھ جا کر ہمارا داخلہ کروادیں۔ نیز اپنے ایک پرانے ملازم سکندر کو ہمارے ساتھ علی گڑھ رہنے کیلئے فرما گئے۔ چنانچہ ہم علی گڑھ پہنچے اور اسکول کے ہیڈ ماسٹر (مسٹر جے۔ سی۔ ریس) کے دفتر میں داخلہ کی غرض سے پیش ہوئے میرا داخلہ تو ہو گیا مگر میرے منجھلے بھائی (ایس ایم یامین صاحب) کی عمر آٹھ سال کی تھی۔ اس لیے ان کے داخلہ میں رکاوٹ ہو رہی تھی۔ کیونکہ بورڈنگ میں داخلہ کیلئے دس سال کی عمر ہونی چاہیے تھی۔ مگر سیکنڈ ہیڈ ماسٹر (میر ولایت حسین صاحب) کی سفارش پر ان کا داخلہ بھی ہو گیا۔ اب تیسرے بھائی (ایس ایم رفیع صاحب) جن کی عمر چھ سال کی تھی داخلہ کیلئے پیش ہوئے تو ہیڈ ماسٹر صاحب نے ان کو داخل کرنے سے انکار کر دیا۔ میر صاحب نے

جونہایت شفیق استاد تھے کچھ سفارش کرنی چاہی مگر ہیڈ ماسٹر صاحب نے صاف کہہ دیا "Mir Sahib! I can't admit babies in arms"

اب تو یہ ایک مسئلہ بن گیا والد صاحب کے دوست نے اِدھر اُدھر کہا سنا مگر یہ ہی جواب ملا کہ ہیڈ ماسٹر صاحب اتنے چھوٹے بچے کو داخل نہیں کریں گے۔ ایسی صورت میں انہوں نے والد صاحب کو بمبئی تار دیا کہ وہ خود آئیں اور اس معاملہ کو طے کریں۔ ان دِنوں جدّہ کیلئے بمبئی سے مہینہ میں صرف ایک مرتبہ جہاز چلتا تھا۔ اور وہ روانگی کیلئے تیار تھا۔ اس لیے والد صاحب کو اپنی روانگی آئندہ ماہ کے جہاز سے کرانی پڑی اور وہ خود علی گڑھ تشریف لائے۔ مگر جس سے بھی گفتگو کی یہی جواب ملا کہ آپ کے چھوٹے لڑکے کا داخلہ ممکن نہیں۔ البتہ صاحبزادہ آفتاب احمد خان صاحب نے مشورہ دیا کہ آپ آنریری سیکرٹری (نواب وقار الملک بہادر) سے ملیں شاید وہ آپ کی کچھ مدد کر سکیں۔ چنانچہ اسی شام والد صاحب ہم کو لیکر نواب صاحب کی کوٹھی پر پہنچے۔ اور اُن سے سب کیفیت بیان کی۔ نواب صاحب نے فرمایا کہ ہیڈ ماسٹر صاحب کا فیصلہ بالکل صحیح ہے اور اُنہوں نے یہ بھی بڑی رعایت کی کہ آپ کے منجھلے لڑکے کو داخل کر لیا۔ اب تو قطعی ناامیدی ہوگئی۔ کچھ وقفہ کے بعد نواب صاحب نے فرمایا۔

"ڈاکٹر صاحب: میں آپ کی دشواری سمجھ رہا ہوں اور سوچتا ہوں کہ اگر ان حالات میں یہ ادارہ آپ کی مدد نہ کر سکے تو اس کے ہونے کا کیا فائدہ؟ میں ہیڈ ماسٹر صاحب کو لکھ دونگا کہ آپ کے چھوٹے لڑکے کو میری ذمہ داری پر داخل کر لیا جائے اور جو شرائط ہیڈ ماسٹر صاحب تجویز کریں وہ آپ کو منظور کرنی ہوں گی۔"

والد صاحب نے نواب صاحب کا شکریہ ادا کیا اور ان کا ہیڈ ماسٹر صاحب کے نام خط لیکر

رخصت ہوئے۔ اس وقت جو میں یہ واقعہ لکھ رہا ہوں نواب صاحب کا بارعب چہرہ میری آنکھوں کے سامنے ہے اور اُن کے الفاظ میرے کانوں میں گونج رہے ہیں۔

دوسرے دن صبح ہیڈ ماسٹر صاحب سے ملاقات ہوئی۔ انہوں نے نواب صاحب کا خط پڑھ کر فرمایا کہ اب مجھے کوئی دشواری نہیں، البتہ شرائط کے متعلق والد صاحب سے کہا کہ آپ لڑکوں کے اخراجات کیلئے کافی روپیہ جمع کرا رہے ہیں اور اپنا ایک پرنا ملازم بھی ان کے ساتھ رکھ رہے ہیں مگر میں چاہتا ہوں کہ آپ ایک لوکل گارجین کا اور انتظام کریں۔ والد صاحب نے کچھ حضرات کے مشورہ سے اسکول کے ایک استاد (شاہ مصطفیٰ احمد صاحب) سے جو ماریسن کورٹ میں ہاؤس ماسٹر بھی تھے کیفیت بیان کی۔ اور اس سلسلہ میں درخواست کی۔ شاہ صاحب نے فرمایا کہ میں اس خدمت کو بخوشی قبول کروں گا والد صاحب نے معاوضہ کے متعلق گفتگو کرنی چاہی تو شاہ صاحب نے فرمایا کہ اگر معاوضہ کا خیال ہے تو آپ کسی اور شخص کو منتخب کریں۔ میں نے تو یہ ذمہ داری اسی لئے قبول کی تھی کہ آپ کی دشواری میں کچھ مدد کر سکوں۔ ایسی صورت میں ہو ہی کیا سکتا تھا۔ ہم تینوں کا داخلہ ماریس کورٹ میں ہوا اور شاہ صاحب کے برابر والا کمرہ رہائش کیلئے تجویز ہوا۔

سوچنے کی بات ہے کہ نواب صاحب اور شاہ صاحب کے فیصلوں کی روشنی میں علی گڑھ کیسا عظیم ادارہ ہوگا۔ کیا آج کل کوئی ایسی مثال پیش کی جا سکتی ہے؟ تقریباً تین سال بعد شاہ صاحب بغرض اعلیٰ تعلیم انگلستان تشریف لے گئے تو ہم اسکول کے ایک بہتر ہوسٹل میکڈنل ہاؤس میں منتقل ہو گئے۔ وہاں عزیز بخش صاحب ہاؤس ماسٹر تھے جو بظاہر گرم مگر دل کے نرم مشہور تھے۔

کچھ اسکول کے متعلق

اسکول کا نظام کچھ اس طور پر تھا کہ ہیڈ ماسٹر صاحب اسکول شروع ہونے سے تقریباً آدھ گھنٹہ قبل وہاں پہنچ جاتے تھے اور صفائی جھڑ کاؤ وغیرہ کا معائنہ کرتے تھے۔ ایسی صورت میں اسکول کا عملہ بہت پہلے پہنچ کر اپنا کا سر انجام دیتا تھا۔ اتنے میں کلاس ماسٹر صاحبان حاضری کے رجسٹر سمیت مقررہ جگہ پر پہنچ جاتے تھے۔ اور ان کی کلاسیں اسکول یونیفارم (ٹرکش کیپ اور کالا ٹرکش کوٹ) میں ان کے سامنے قطار باندھ کر کھڑی ہو جاتی تھیں۔ ہیڈ ماسٹر صاحب ہر کلاس کا معائنہ کرتے تھے اور کچھ لڑکوں کو قطار سے باہر کر دیتے تھے۔ جو قریب ہی ہیڈ ماسٹر صاحب کے دفتر کے سامنے انتظار کرتے تھے۔ کلاس ماسٹر صاحبان حاضری لے کر اپنی اپنی کلاس کو قطار کی شکل میں کلاس روم لے جاتے تھے اور اسکول کا گھنٹہ بجتے ہی پڑھائی شروع ہو جاتی تھی۔ قطار سے نکالے ہوئے لڑکوں سے ہیڈ ماسٹر صاحب بازپُرس کرتے تھے مثلاً یہ کہ تمہارا جوتا صاف کیوں نہیں ہے؟ تم نے موزہ کیوں نہیں پہنا؟ تمہارے کپڑے میلے کیوں ہیں؟ تمہارے کوٹ کا بٹن کیوں ٹوٹا ہوا ہے؟ تمہارے بال کیوں نہیں کٹے؟ وغیرہ وغیرہ۔ ان کو ہدایت ہوتی تھی کہ آئندہ ایسا نہیں ہونا چاہیے۔ کسی کسی

کی جو پہلے بھی قطار سے نکالا جا چکا ہو پٹائی بھی ہو جاتی تھی۔ مگر زیادہ تر ''امپوزیشن'' کی سزا ملتی تھی۔ اسکول کے دوران ہیڈ ماسٹر صاحب کلاسوں کو دیکھتے تھے کہ پڑھائی کیسی ہو رہی ہے اور ڈسپلن کیسا ہے۔ آخری گھنٹہ میں امپوزیشن رجسٹر کلاسوں میں گھمایا جاتا تھا کہ اگر ماسٹر صاحبان نے کسی غلطی پر یہ سزا تجویز کی ہو تو اس لڑکے کا نام اس رجسٹر میں لکھ دیں۔ امپوزیشن کا مطلب یہ تھا کہ اسکول ختم ہونے پر سب لڑکے تو اپنے بورڈنگ یا گھروں کو چلے جاتے تھے مگر امپوزیشن والے حضرات ہیڈ ماسٹر صاحب کے دفتر کے قریب ایک کلاس روم میں جمع ہوتے تھے جہاں ان کی حاضری لی جاتی تھی۔ اور ان کو زیادہ تر کمپوزیشن کی مشق کرائی جاتی تھی۔ بعض اوقات پرونن سی ایشن صحیح کرایا جاتا تھا۔ اس کلاس کا وقت اسکول کے ایک گھنٹہ کے برابر ہوتا تھا۔ امپوزیشن سے گو لڑکوں کو فائدہ ہوتا تھا۔ مگر سزا یوں محسوس ہوتی تھی کہ سب ساتھی تو چلے گئے اور یہ رُکے ہوئے ہیں۔

میں سوچتا ہوں کہ آج کل کے اسکولوں میں یہ طریقہ کیوں نہ جاری کیا گیا۔

............☆☆☆............

اسکول کے بورڈنگ ہاؤس

علی گڑھ کی روح دراصل اس کا اقامتی نظام ہے۔ اس زمانہ میں پچھتر فی صد طلبہ کو بورڈنگ میں رہنا پڑتا تھا اور پچیس فی صد ڈے اسکالر ہو سکتے تھے ڈے اسکالروں میں سے اکثر اساتذہ کے عزیز ہوتے تھے اس لیے وہ بھی اساتذہ کے ساتھ کیمپس ہی میں رہتے تھے۔ شہر سے آنے والے ڈے اسکالروں کی تعداد کم ہوتی تھی اور یہ اس لئے بھی کہ شہر میں سٹی اسکول تھا جس میں شہر کے زیادہ تر لڑکے پڑھتے تھے۔ اور یہ ڈے اسکالر ہوتے تھے۔ طلباء کی بہت بڑی تعداد کے بورڈنگ میں رہنے سے اور اساتذہ کی بہت بڑی تعداد کے کیمپس میں رہنے سے ایک عجیب سا ماحول پیدا ہو گیا تھا۔ اور یہ ہی وہ ماحول تھا جس نے استاد اور شاگرد کے رشتہ کو استوار کر دیا تھا۔ اور جو طلباء کی تربیت کا بھی ضامن تھا۔ اس زمانہ میں اسکول کے چار بورڈنگ تھے۔ ایک چھوٹے بچوں کیلئے ''ظہور وارڈ'' اور تین بڑے لڑکوں کیلئے ''ماریسن کورٹ'' ''ممتاز ہاؤس'' اور ''میکڈنل ہاؤس'' ہر بورڈنگ میں تقریباً تیس سے چالیس لڑکوں پر ایک ہاؤس ماسٹر مقرر ہوتے تھے۔ اور ان میں سے ہر ایک باری باری اپنے بورڈنگ کی مختلف سرگرمیوں کے بھی ذمہ دار ہوتے تھے۔ مثلاً ڈائننگ ہال،

ہوم ورک اور کھیل وغیرہ ہاؤس ماسٹر صاحبان اپنی اپنی باری پر ناشتے اور کھانے کے اوقات میں، ہوم ورک کے وقت کھیل کے میدان میں موجود رہتے تھے۔ نماز کیلئے ہر بورڈنگ میں ایک پیش امام صاحب مقرر تھے اور نماز میں طلباء کی حاضری لازمی تھی۔ ہاؤس ماسٹر صاحبان خود بھی نماز میں شریک ہوتے تھے۔ سینئیر طلباء بورڈنگ کی مختلف سرگرمیوں کیلئے عہدیدار مقرر کئے جاتے تھے۔ مثلاً ہاؤس مانیٹر، فوڈ مانیٹر، پریئر مانیٹر اور کھیلوں کے کپتان وغیرہ۔ جو ہاؤس ماسٹر صاحبان کی نگرانی میں اپنے فرائض انجام دیتے تھے۔ بورڈنگ ہاؤس میں ایک گھر کی سی فضا ہوتی تھی اور طلباء کا یہ حال تھا کہ چھٹیوں میں گھر جانے سے طبیعت گھبراتی تھی اور چھٹیاں ختم ہونے پر علی گڑھ پہنچنے کی خوشی ہوتی تھی۔ افسوس: کہ آج کل اقامتی درس گاہیں اول تو ہیں ہی کمی کے ساتھ اور جو ہیں بھی ان میں وہ بات کہاں؟ اب محسوس ہوتا ہے کہ

''خواب تھا جو کچھ کہ دیکھا جو سُنا افسانہ تھا''

یہ حقیقت ہے کہ جو دوستیاں اسکول، کالج اور یونیورسٹی کے بورڈنگوں میں قائم ہوئیں ویسی پھر کبھی نہ ہوسکیں۔

میرے ان دوستوں میں سے اکثر اس دنیا سے رخصت ہو چکے ہیں۔ اور میں ان کی یاد میں اکثر یہ شعر دوہراتا رہتا ہوں۔

اے ہم نفسانِ محفلِ ما
رفتید، ولے نہ از دلِ ما

اسکول کے اساتذہ

اسکول کے سبھی استاد نہایت اچھے، محنتی، قابل اور فرض شناس تھے اور طلباء کے ساتھ بڑی شفقت سے پیش آتے تھے۔ میری یاد میں خاص طور پر ماسٹر نورالحسن صاحب اور ماسٹر صبیح الدین حیدر صاحب محفوظ ہیں کہ جن کی شخصیتوں کا مجھ پر گہرا اثر پڑا اور جس نے بڑی حد تک مجھے ٹیچنگ لائن کی طرف مائل کیا۔ حالانکہ میرے خاندان میں سرکاری ملازمت یا وکالت وغیرہ کو ترجیح دی جاتی تھی اور ٹیچنگ کی طرف کسی کی توجہ نہ تھی۔ کالج اور یونیورسٹی کے زمانے میں بھی پروفیسر اے ایف رحمٰن، ڈاکٹر ایل کے حیدر اور مولانا سلیمان اشرف صاحب جیسے استاد ملے کہ جن کی شخصیت اور کردار نے ٹیچنگ کی طرف میرے رجحان کو پختگی بخشی۔

اسکول کے زمانہ کی چند شرارتیں

نوٹ:۔ اس سلسلہ میں کسی کا نام نہیں لکھا گیا۔ پھر بھی ۔ تاڑ جاتے ہیں تاڑنے والے:۔

ایک ماسٹر صاحب کلاس میں آتے ہی کرسی پر بیٹھ، میز کی دراز کھول، چاک اور جھاڑن نکالتے تھے، لڑکے بعض اوقات مینڈک پکڑ کر میز کی دراز میں بند کردیتے تھے اور جیسے ہی دراز کھلتی مینڈک اچکنے لگتے۔ لڑکے ہنس پڑتے اور ماسٹر صاحب ناراض ہوتے۔

ایک موقعہ پر لڑکے کلاس میں سوالوں کے جواب صحیح نہیں دے رہے تھے اور یہ محض ایک لڑکے کی وجہ سے ہوا جو سبق یاد نہیں کرتا تھا اور چاہتا تھا کہ کلاس کی آڑ میں سزا سے بچ جائے۔ ماسٹر صاحب نے ہر چند کوشش کی کہ لڑکے کلاس ہی میں سبق یاد کرلیں مگر لڑکوں نے ایسا نہیں کیا۔ اس لیے ماسٹر صاحب نے فیصلہ کیا کہ اسکول ختم ہوتے ہی وہ اس کلاس میں آجائیں گے اور پوری کلاس بھی حاضر رہے گی اور جب تک ہر لڑکے کو سبق یاد نہ ہوجائے گا چھٹی نہیں ملے گی۔ چنانچہ یہ کلاس شروع ہوئی مگر لڑکوں نے سبق یاد نہ کیا۔ اس طرح کئی گھنٹے گزر گئے اور بھوک نے زور پکڑا۔ اب لڑکوں نے اس لڑکے سے کہا کہ ہمیں تو بھوک

لگ رہی ہے اور ہم سبق سنا کر جاتے ہیں تم بیٹھے رہنا۔ اس لڑکے نے کہا، ذرا ٹھہر جاؤ، میں تمہاری بھوک کا انتظام کرتا ہوں۔ وہ کسی بہانہ سے اجازت لیکر کلاس سے باہر گیا اور جتنے خربوزہ بیچنے والے ملے سب کو لا کر کلاس سے باہر ٹھہرا دیا اور خود خربوزہ کھا کر کلاس میں آیا۔ اور اشارے سے لڑکوں کو سمجھایا کہ اجازت لیکر باری باری باہر جاؤ۔ اور خربوزے کھا کر کلاس میں آ جاؤ۔ اب کیا تھا۔ لڑکوں نے ایسا ہی کیا اور مستعدی سے کلاس میں جمے رہے جب بہت دیر ہوگئی تو ماسٹر صاحب نے کہا۔

''اب ہم سب کو بہت بھوک لگی ہے لہٰذا اس وقت جاؤ اور کل پھر ہی کچھ ہوگا۔''

اب جو کلاس سے باہر نکلے تو ماسٹر صاحب دیکھتے ہیں کہ خربوزوں کے چھلکوں کا ڈھیر لگا ہوا ہے یعنی لڑکوں نے خربوزوں سے پیٹ بھر لیا تھا۔ اور بھوکے صرف ماسٹر صاحب ہی رہے۔

دوسرے دن لڑکوں نے کلاس میں سبق سنا دیا۔ اس لئے اسکول کے بعد رکنے کی نوبت نہ آئی۔ یہ شرارت مدتوں تک سینہ بہ سینہ اسکول کی نئی نسلوں تک پہنچتی رہی اور وہ اس سے لطف اندوز ہوتے رہے۔ مجھے یہ بات میرے لڑکوں نے بتائی جب وہ اسکول میں پڑھتے تھے۔

اسکول کے بعض بورڈنگوں کے صحن میں ٹینس کورٹ ہوتے تھے اور لڑکے وہاں ٹینس کھیلا کرتے تھے۔ ایک ہاؤس ماسٹر صاحب کو ورزش کا شوق ہوا اور انہوں نے بھی وہاں ٹینس کھیلنا شروع کر دیا اور اس انداز سے کہ پہلے سیٹ میں شریک ہوتے اور آخری سیٹ تک مستقل کھیلتے رہتے۔ لڑکوں کیلئے یہ ایک عجیب مسئلہ بن گیا۔ ماسٹر صاحب کی موجودگی میں آپس کی ہنسی مذاق کا سوال ہی نہ تھا۔ پہلے تو خیال ہوا کہ شاید یہ عارضی چیز ہو مگر جب ایسا

نہ ہوا تو یہ طے پایا کہ ماسٹر صاحب کے مخالف کھلاڑی کچھ اس ترکیب سے کھیلیں کہ ان کی گیند ماسٹر صاحب کو جا لگے۔ اور ماسٹر صاحب کے پارٹنر جو پیچھے کھیلتے تھے کچھ اس طرح گیند واپس کریں کہ وہ بھی ماسٹر صاحب کی مزاج پرسی کرے۔ جب گیند ماسٹر صاحب کو لگتی تو لڑکے فوراً افسوس ظاہر کرتے اور معافی مانگتے۔ مگر سلسلہ وہ ہی جاری رہتا ماسٹر صاحب اس معاملہ کی تہہ کو پہنچ گئے اور دوسرے دن بجائے ٹینس کے چہل قدمی شروع کر دی۔

یہ ہیں علی گڑھ کے کارکن، اسکول اور اس کے بورڈنگ، اساتذہ اور طلباء کی کچھ جھلکیاں کہ جن کی بدولت علی گڑھ میں ایک ایسا ماحول پیدا ہو گیا تھا کہ ''علیگ'' جب پڑھ لکھ کر نکلتے تو ''جس زمیں پہ رہے آسماں رہے''......ان پر پوری طرح صادق آتا تھا۔ اور اسکول کے قیام کے وقت جو مندرجہ ذیل دعا مانگی گئی تھی اللہ تعالیٰ نے اسے شرفِ قبولیت بخشا۔

تلامیذ تیرے دودم ہو کے نکلیں
سپاہی اور اہلِ قلم ہو کے نکلیں

............☆☆☆............

ایم۔اے۔او۔کالج

زباں پہ بارِ خدایا یہ کس کا نام آیا !

انٹرنس پاس کرنے کے بعد ایم۔اے۔او۔کالج میں داخلہ لیا۔اوراس طرح اسکول کی زندگی کے بعد کالج کی زندگی کا آغاز ہوا۔ یہاں یہ بتانا دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ ان دنوں قاعدے کم ہوتے تھے اوران پر پابندی بڑی سختی کے ساتھ ہوتی تھی۔ چنانچہ ایک قاعدہ یہ تھا کہ سولہ برس سے کم عمر کا طالب علم انٹرنس کے امتحان میں شریک نہیں ہوسکتا تھا۔میری عمر تقریباً ایک سال کم تھی۔اس لئے امتحان میں شریک ہونے سے روک دیا گیا۔اوراسکول کے رجسٹر میں میرے نام کے آگے لکھ دیا گیا۔ "Detained being Under age" گومیرا ایک سال ضائع ہوا۔مگر میں سمجھتا ہوں کہ یہ بہت اچھا قاعدہ تھا۔آج کل ایسا کوئی قاعدہ نہیں اوراس کے نتیجے میں بہت کم عمر طالب علم میٹرک پاس کر کے کالج میں داخلہ لیتے ہیں جودراصل عمراور جسم کے لحاظ سے کالج میں داخلہ کے لائق نہیں ہوتے۔ یہ مسئلہ قابل غور ہے اور میٹرک کیلئے عمر کی شرط ضرور ہونی چاہیے۔اس کے علاوہ قاعدے کم ہوں مگران پر پابندی سختی سے ہونی چاہیے۔آج کل تعلیمی اداروں میں اس کے برعکس معاملہ ہے۔اسکول

کے مقاصد میں کالج میں بہت زیادہ آزادی ہوتی تھی۔ طلباء اپنے مضامین کے لحاظ سے ٹائم ٹیبل کے مطابق کلاسوں میں شریک ہوتے تھے۔ اساتذہ گھنٹہ شروع ہونے پر حاضری لیتے تھے اور پھر اپنے مضمون پر لیکچر دیتے تھے۔ کالج کی کلاسیں دوپہر تک ختم ہو جاتی تھیں اور طالب علم اپنے بورڈنگ یا گھروں کو چلے جاتے تھے۔ یہ ایک معمول سا بنا ہوا تھا۔ مگر ''علیگ'' جن کو کہنا چاہیے وہ بورڈنگ، کھیلوں کے میدان اور اسٹوڈنٹس یونین میں نشوونما پاتے تھے۔

............☆☆☆............

کالج کے بورڈنگ

ایم۔اے۔او۔کالج کے زمانہ میں "Under - graduates" سرسید کورٹ اور سید محمود کورٹ میں رہا کرتے تھے اور "Graduates" ''صاحب باغ'' میں رہتے تھے۔ بورڈنگ کا معمول کچھ اس طور پر تھا کہ صبح نماز پھر کمرے میں ناشتہ جس کا انتظام کمرے کے طلباء خود کرتے تھے، پھر کالج میں پڑھائی اور کالج سے واپسی پر دوپہر کا کھانا اٹینگ ہال میں پھر آرام اور سہ پہر کو کوئی نہ کوئی کھیل اور اگر اور کچھ نہیں تو چہل قدمی۔ کالج کی مسجد بورڈنگ سے ملحق تھی اور زیادہ تر طلباء پانچوں وقت کی نماز مسجد میں ادا کرتے تھے۔ بورڈنگ کے سلسلے میں ایک خاص بات یہ تھی کہ کسی ایک شہر کے اور اگر ہو سکے تو کسی ایک صوبہ کے لڑکے ایک کمرے میں نہیں رکھے جاتے تھے۔ مثال کے طور پر ہم تین روم فیلوز میں میرا تعلق پنجاب اور یو پی سے تھا دوسرے کا بہار سے اور تیسرے کا سی پی سے۔ بورڈنگ کے منتظم سینئر ٹیوٹر اور اسسٹنٹ ٹیوٹر سینئر استاد ہوتے تھے۔ جو بورڈنگ سے باہر رہتے تھے۔ اور اسسٹنٹ ٹیوٹر جونیئر استاد یا بعض اوقات گریجویٹ طلباء ہوتے تھے۔ اسسٹنٹ ٹیوٹر کو بورڈنگ ہی میں رہنا پڑتا تھا۔ سرسید کورٹ اور سید محمود کورٹ دو دو بورڈنگ میں تقسیم تھے۔ اور اس طرح

چاروں بورڈنگ کیلئے چار سینئر ٹیوٹر اور چار اسسٹنٹ ٹیوٹر بنوا کر سینئر طلباء مختلف سرگرمیوں کیلئے عہدے دار بنائے جاتے تھے مثلاً ہاؤس مانیٹر، فوڈ مانیٹر وغیرہ۔ جو سینئر ٹیوٹر اور اسسٹنٹ ٹیوٹر کی ہدایت پر کام کرتے تھے۔ ڈائننگ ہال کالج کے چاروں بورڈنگ کیلئے مشترک تھا اور اس کیلئے ایک الگ سینئر ٹیوٹر تھے۔ ہمارے زمانہ میں ڈائننگ ہال شروع ہونے سے پیشتر سینئر ٹیوٹر صاحب گیٹ پر آموجود ہوتے تھے کہ کوئی لڑکا بغیر یونیفارم ڈائننگ ہال میں نہ جائے۔ یونیفارم کی بہت سختی تھی۔ کلاسوں میں، ڈائننگ ہال میں، شہر میں اور فنکشن پر یونیفارم پہننا لازمی تھا۔ یونیفارم پہلے ٹرکش کیپ اور کالا ٹرکش کوٹ تھا۔ اور پھر کالی شروانی کر دیا گیا تھا۔ بورڈنگ کی ایک خاص بات یہ تھی کہ جونیئر طلبا سینئر طلبا کا بہت احترام کرتے تھے اور سینئر طلباء، جونیئر طلباء کے ساتھ بڑی شفقت سے پیش آتے تھے اور کوشش کرتے تھے کہ نئے طلباء علی گڑھ کی روایات سے واقف ہو جائیں اور ان پر عمل کریں اور رفتہ رفتہ علی گڑھ کے رنگ میں رنگ جائیں۔

............☆☆☆............

کالج کے کھیل

(الف) علی گڑھ میں کھیلوں کی روایت بڑی شاندار تھی علی گڑھ میں اور نیز اس کے باہر دوسری ٹیموں کے مقابلے میں جیت زیادہ تر علی گڑھ ہی کی ہوتی تھی۔ اس کامیابی میں علی گڑھ کے طریقہ کار کو بڑا دخل تھا۔ مثلاً پریکٹس کی باقاعدگی اور وہ بھی کھیل کے لباس میں، کلر ملنے اور ٹیم میں لئے جانے میں انصاف، کپٹن کے احکامات کا لحاظ وغیرہ وغیرہ ان سب کے نتیجہ میں کھلاڑی کا ایک نمایاں کردار بنتا تھا جو آئندہ زندگی میں بہت کام آتا تھا۔ کھیلوں کے معاملہ میں ایک طالب علم کسی ایک کھیل کو اپناتا تھا تاکہ اس میں خوب مہارت حاصل کر سکے۔

(ب) میرا تعلق ہاکی سے تھا، اسلئے میں اس کے متعلق ذرا تفصیل سے لکھ رہا ہوں۔ ہاکی کی پریکٹس روزانہ وقت مقررہ پر بڑی باقاعدگی سے ہوتی تھی تمام کھلاڑی کھیل کے لباس میں ہوتے تھے۔ ایک ٹیم کے کھلاڑی سفید بنیان یا قمیض پہنتے تھے اور دوسری ٹیم کے کھلاڑی رنگین بنیان یا قمیض پہنتے تھے تاکہ ہر ٹیم کے کھلاڑی الگ دکھائی دیں۔ کھلاڑی بڑے جوش خروش سے پریکٹس کرتے تھے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے کوئی میچ کھیل رہے ہیں۔ ٹیم میں آنے جانے اور کلر دینے میں کلر ہولڈرز کی

سفارش پر عمل ہوتا تھا اور ان معاملات میں انصاف اور غیر جانبداری سے کام لیا جاتا تھا اس لئے کھلاڑیوں کو کوئی شکایت نہیں ہوتی تھی۔ ٹیم اکثر علی گڑھ سے باہر ٹورنامنٹ میں شریک ہوا کرتی، مثلاً لکھنو، بدایوں، آلہ آبا، دکلکتہ، بمبئی وغیرہ۔ ان شہروں میں اولڈ بوائز بڑی آؤ بھگت اور مہمان نوازی کرتے تھے۔ کھلاڑی ان سے مل کر اور وہ کھلاڑیوں سے مل کر بہت خوش ہوتے تھے۔ علی گڑھ کے قصے دوہرائے جاتے تھے جس سے دونوں کی معلومات میں اضافہ ہوتا تھا۔ ٹیم کو اس بات کا بہت خیال رہتا تھا کہ ان کے رویہ سے اولڈ بوائز پر اچھا اثر پڑے۔

ہاکی کا ایک واقعہ بڑا دلچسپ ہے:۔

ہم لوگ آغا خان ہاکی ٹورنامنٹ میں شرکت کی غرض سے بمبئی گئے تھے۔ یہ ٹورنامنٹ ڈیڑھ دو مہینے چلتا تھا۔ قاعدے کے مطابق ہر ٹیم کو اپنے پندرہ کھلاڑیوں کے نام داخل کرنے پڑتے تھے اور انہیں میں سے ان کے کھیل کی ٹیم بن سکتی تھی۔ ان کے علاوہ کوئی اور کھلاڑی شریک نہیں ہو سکتا تھا۔ کھیل کے لحاظ سے علی گڑھ کی ٹیم بڑی اچھی مانی جاتی تھی۔ اس کے علاوہ اور ٹیمیں بھی اچھی ہوتی تھیں خاص کر کسٹمز کی ٹیم بڑی عمدہ ہوتی تھی۔ اتفاق سے کسٹمز کی ٹیم کا ایک نہایت اچھا کھلاڑی ملک سے باہر گیا ہوا تھا اور ٹورنامنٹ کے دوران اس کی واپسی کا کوئی امکان نہ تھا اس لئے پندرہ کھلاڑیوں میں اس کا نام شامل نہ تھا۔ ہماری ٹیم مختلف میچ جیت کر آگے بڑھتی رہی اور ہمارا اگلا میچ کسٹمز کی ٹیم کے خلاف ہونا تھا۔ کسٹمز کا وہ کھلاڑی جو باہر گیا ہوا تھا اور جس کا نام پندرہ کھلاڑیوں کی فہرست میں نہ تھا ایک دو روز میں واپس آنے والا تھا۔ اب کسٹمز کے کھلاڑی ہمارے پاس آئے اور کہا کہ اگر ہمیں اعتراض نہ ہو تو وہ اس کھلاڑی کو اپنی ٹیم میں شامل کر لیں۔ ہم نے کہا کہ اگر قاعدہ اجازت دیتا ہو تو ضرور شامل کر لیں۔ انہوں نے ٹورنامنٹ کمیٹی سے درخواست کی مگر چونکہ قاعدے کے

خلاف تھا اس لئے اجازت نہ ملی۔ ہمارے خلاف میچ میں کسٹمز نے بہت زور لگایا مگر وہ ہار گئے۔ بہرحال

مقابلہ تو دل ناتواں نے خوب کیا

ہم نے کسٹمز کے علاوہ اور ٹیموں کے کو ہرا کر آغا خان ٹورنامنٹ جیت لیا۔ اس کے بعد کسٹمز کے کھلاڑی ہمارے پاس پھر آئے اور کہا کہ اب ہم ان سے ایک میچ کھیلیں، جس میں ان کا وہ کھلاڑی بھی شریک ہوگا جو آغا خان ٹورنامنٹ میں نہ کھیل سکا تھا۔ ہم نے کہا کہ ٹورنامنٹ تو ختم ہو چکا ہے اب میچ کھیلنے سے کیا حاصل؟ اور اگر کھیلنا ہی ہے تو ہم ٹورنامنٹ کی تمام ٹیموں کے سیلیکٹڈ کھلاڑیوں کی ٹیم سے کھیلنے کو تیار ہیں۔ کسٹمز بہت خوش ہوئے اور اس تجویز کو منظور کر لیا اور چونکہ انہیں یقین تھا کہ ایسی چُنی ہوئی ٹیم ہم سے ضرور جیت جائیگی اس لئے انہوں نے کہا کہ وہ اس میچ میں ایک کپ بھی رکھیں گے اور تین چار سو روپے کا ایک چاندی کا کپ بھی لے آئے اور ان کا خیال تھا کہ جیتنے کے بعد اسے واپس کر دیں گے۔ اس میچ کی بہت شہرت ہوئی اور بیشمار خلقت اسے دیکھنے کیلئے ٹوٹ پڑی۔ بمبئی کیلئے بھی ایک ایسا میچ ایک نئی بات تھی۔ میچ شروع ہوا اور بڑے جوش وخروش سے مقابلہ ہوتا رہا۔ پہلے ہاف ٹائم میں کسی کا گول نہیں ہوا۔ دوسرے ہاف ٹائم میں بھی آدھے وقت تک یہی صورت رہی۔ اس کے بعد ہماری ٹیم نے بڑی خوبصورتی کے ساتھ ایک گول کر دیا۔ میچ دیکھنے والوں میں کھلاڑیوں سے بھی زیادہ جوش وخروش تھا۔ اب میچ نے اور زیادہ تیزی پکڑی کسٹمز کی بڑی کوشش تھی کہ وہ گول اتار دیں اور ہماری کوشش تھی کہ ایسا نہ ہونے پائے۔ غرض اسی کش مکش میں وقت ختم ہو گیا اور جیت ہماری رہی۔ کسٹمز کی عجب کیفیت تھی۔ ایک تو ہارنے کی خفت اور دوسرے کپ کے تین چار سو روپیہ کی چپت۔ وہ پھر ہمارے پاس آئے اور کہا کہ جیت تو آپ کی ہو ہی چکی ہے اب آپ کپ نہ لیں۔ ہم نے کہا کہ یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ ہمیں تو جیتا ہوا کپ کالج میں داخل کرنا ہے۔ بہرحال تالیوں کی گونج میں وہ کپ ہم کو ملا جو علی گڑھ

لائبریری میں علی گڑھ کی ٹیموں کے جیتے ہوئے کپس میں ممتاز حیثیت سے موجود ہے۔

ہاکی کے متعلق ایک اور بات دلچسپی کا باعث ہوگی، میں جس زمانہ میں ہاکی کا کپتان تھا ہاکی کلب کے پریزیڈنٹ پروفیسر لی تھے۔ ان سے جب کبھی ہاکی کے بارے میں گفتگو کرنا ہوتو وہ ہمیشہ فرماتے تھے:۔

"Come and have breakfast with me tomorrow morning" میں صبح جب ان کے یہاں جاتا تھا تو بڑی شفقت سے پیش آتے تھے۔ اور نہایت عمدہ بریک فاسٹ کھلاتے تھے اور ہاکی کے متعلق جو بات ہو بڑی توجہ سے سنتے تھے اور خاطر خواہ فیصلہ کرتے تھے۔ میرے ساتھی کرکٹ اور فٹ بال وغیرہ کے کپتانوں کو یہ بات حاصل نہ تھی۔ وہ اکثر اپنے پریذیڈنٹس کو پروفیسر لی کی بابت بتلاتے تھے مگر کوئی ٹس سے مس نہیں ہوتا تھا!

(ج) کھیلوں کے سالانہ فنکشن بڑی دھوم دھام سے ہوتے تھے۔ ان سب میں اسپورٹس کا سالانہ فنکشن بہت شاندار ہوتا تھا۔ اس موقع پر معزز مہمان بڑی دور دور سے تشریف لاتے تھے اور اس سلسلے میں نہایت بڑے پیمانے پر ایٹ ہوم ہوتا تھا۔ اس فنکشن کے آغاز کا عجیب سلسلہ تھا۔ اسپورٹس کے پریذیڈنت وقت مقررہ پر گھوڑے پر سوار میدان میں داخل تھے اور ایک طمنچہ سے ہوائی فائر کرتے تھے اور اس کے ساتھ ہی فائنل ایونٹس شروع کرائے جاتے تھے۔ مہمان طلباء کی کارکردگی کی خوب خوب داد دیتے تھے۔ آخر میں ٹینٹ پیگنگ شو ہوتا تھا جو کالج کے رائیڈنگ اسکول کا خاص فن تھا۔ اس کے بعد تقسیم انعامات اور کھانے پینے کیساتھ یہ پُرلطف فنکشن ختم ہوتا تھا۔

............☆☆☆............

اسٹوڈنٹس یونین

علی گڑھ کی زندگی میں اسٹوڈنٹس یونین کو بڑی اہمیت حاصل تھی۔ یونین کی خاص چیز یعنی ڈیبیٹ ہفتہ کی شام کو کھانے کے بعد ہوا کرتی تھی اور اس دن اس وقت کالج میں اور کوئی فنکشن نہیں ہوتا تھا۔ اتوار کی چھٹی ہوتی تھی اس لئے جلسے کا اثر کالج کی پڑھائی پر نہیں پڑتا تھا۔ طلباء کے علاوہ اساتذہ بھی شرکت کرتے تھے۔ جو طلباء ڈیبیٹ میں زیادہ حصہ لیتے تھے وہ بہترین مقرر بن کر نکلتے تھے۔

یونین کا سالانہ الیکشن بڑی گرم جوشی سے ہوتا تھا۔ مخالف پارٹیاں بہت زیادہ زور لگاتی تھیں اور اپنے اپنے کینڈیڈیٹ کے جیتنے کیلئے ہر ممکن کوشش کرتی تھیں۔ الیکشن کے دوران خوب مخالفتیں ہوتی تھیں۔ مگر علی گڑھ کی یہ خاص روایت تھی کہ الیکشن کے بعد تمام مخالفتیں ختم ہو جاتی تھیں اور ہارنے اور جیتنے والے مل جل کر کام کرتے تھے۔ علی گڑھ میں یونین کا مقصد مقرر پیدا کرنا ہوتا تھا اور اس میں اس کو بڑی کامیابی ہوتی تھی۔

میں سوچتا ہوں کہ پاکستان کے اعلیٰ تعلیمی اداروں میں غیر نصابی سرگرمیاں کیوں نہ پنپ سکیں۔ اول تو یہ سرگرمیاں ہیں ہی بہت کم اور جو ہیں بھی تو ان کا معیار بہت پست ہے۔

یہی حال کھیلوں کا ہے اور یہی اسٹوڈنٹس یونین کا۔ یونین کے متعلق تو یہ کہنا پڑتا ہے کہ اس نے ٹریڈ یونین کی شکل اختیار کر لی ہے۔ اس کو ڈیبیٹ وغیرہ سے دُور کا بھی واسطہ نہیں اور الیکشن کے بعد مخالفتیں ختم ہونے کے بجائے اور شدت پکڑتی ہیں اور ہاری ہوئی پارٹی کی کوشش ہوتی ہے کہ کامیاب پارٹی کو کسی نہ کسی طرح نیچا دکھائے۔

"ببیں تفاوت رہ از کجاست تا بہ کجا"

جہاں تک میں سمجھ سکا ہوں ان خرابیوں کی زیادہ تر وجہ یہی معلوم ہوتی ہے کہ اعلیٰ تعلیمی ادارے حقیقت میں اقامتی ادارے ہیں ہی نہیں اور اگر کوئی ہے بھی تو برائے نام اس کے علاوہ یہ ادارے بڑے شہروں میں قائم ہیں جہاں ان شہروں کی خود اپنی ہڑبونگ کی کمی نہیں جو اداروں پر اثر انداز ہوتی ہیں۔

کالج کے زمانہ کے لطیفے

کالج کے لڑکے کچھ نہ کچھ لطیفے کرتے ہی رہتے تھے۔ان کا کہاں تک ذکر کیا جائے۔ مثال کے طور پر حسبِ ذیل دو لطیفے دلچسپی کا باعث ہوں گے۔

(۱) ایک موقع پر لڑکوں کا آپس میں کچھ جھگڑا ہو گیا۔ایک فریق کا یوپی سے تعلق تھا اور دوسرے کا فرنٹیئر سے۔بات زیادہ بڑھ گئی تو یوپی والوں میں سے ایک شاعر نے فریق مخالف کے متعلق کچھ اشعار کہہ ڈالے جنہیں لڑکوں نے زور زور سے پڑھنا شروع کر دیا۔ فرنٹیئر والوں کو جو غصہ آیا انہوں نے شعر پڑھنے والوں کی پٹائی کر دی۔اب تو یہ معاملہ سینئر ٹیوٹر صاحب کے پاس پہنچا۔اور دونوں فریق کی طلبی ہوئی۔دونوں نے اپنی اپنی شکایات بیان کیں۔سینئر ٹیوٹر صاحب نے سب کچھ سُن کر فرمایا کہ بات یہ ہے کہ یہ تو اللہ میاں کی دین ہے کسی خطہ کو زبان کی تیزی عطا کی ہے اور کسی کو ہاتھ کی۔اس لیے ایک نے زبان چلائی اور دوسرے نے ہاتھ چلایا۔اس پر سب لڑکے ہنس پڑے اور آپس میں گلے مل لئے اور یہ معاملہ رفع دفع ہو گیا۔

(۲) ایک دفعہ ایک کمرے کے لڑکوں نے دس بارہ لڑکوں کو چائے کی دعوت دی۔

سب مہمان خوشی خوشی وقت مقررہ پر اس کمرے میں پہنچ گئے۔ اب میزبانوں نے اپنے کمرے کی دیوار پر ٹنگی ہوئی تختی سے کپڑا ہٹا دیا۔ تختی پر لکھا ہوا تھا۔ "Exhibition of Noses" اس پر مہمانوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا تو عجب عجب قسم کے ناک دکھائی دیئے۔ کچھ موٹے، کچھ لمبے، کچھ اونچے، کچھ گول، غرض جتنے مہمان اتنے ہی قسم کے ناک۔ اب تو ناک چڑہوں کو سخت غصہ آیا۔ مگر میزبانوں نے موقع کی نزاکت کو سمجھتے ہوئے چند سینئر طلباء کو بھی مدعو کر رکھا تھا۔ اس لئے ان کی موجودگی میں معاملہ ختم ہو گیا۔ ورنہ میزبانوں کی خوب پٹائی ہوتی۔

علی گڑھ کے متعلق لکھنا گویا دریا کو کوزے میں بند کرنا ہے۔ اور اس ماحول کو کچھ وہ ہی سمجھ سکتا ہے جو اس میں سے گزر چکا ہو۔ ورنہ اوروں کیلئے تو

اک معمہ ہے سمجھنے کا نہ سمجھانے کا

علی گڑھ کے طلباء کے اسی ماحول کی یگانگت، بھائی چارہ اور مساوات کے پیش نظر ایک موقع پر قائداعظم نے فرمایا تھا:۔

''علی گڑھ چھوٹا پاکستان ہے اور پاکستان ایک بڑا علی گڑھ بنے گا۔''

کاش: کہ ایسا ہوتا:

............☆☆☆............

لندن اسکول آف اکنامکس (.L.S.E)

۱۹۲۰ء میں ایم۔اے او کالج مسلم یونیورسٹی بنایا گیا اور اس یونیورسٹی کا پہلا امتحان ۱۹۲۲ء میں ہوا۔ میں اس سال بی۔اے کے امتحان میں شریک ہو کر کامیاب ہوا۔ والد صاحب کا خیال تھا کہ ان کے اثرات کے پیش نظر اور اس لئے کہ میں دو سال علی گڑھ ہاکی ٹیم کا کپتان بھی رہا تھا مجھے سول یا پولیس میں اچھی سرکاری ملازمت مل جائیگی۔ اس کے برخلاف میں ٹیچنگ لائن اختیار کرنا چاہتا تھا اور وہ بھی علی گڑھ یونیورسٹی میں۔ والد صاحب کو ٹیچنگ لائن پسند نہ تھی کہ اس میں روپیہ پیسہ کہاں۔ بہر حال میری خواہش کو دیکھتے ہوئے والد صاحب نے فرمایا کہ اگر ٹیچنگ لائن ہی اختیار کرنی ہے تو ولایت کی ڈگری ہونی چاہئے اور مجھے ولایت بھیجنے کیلئے آمادہ ہو گئے۔ میں اکنامکس پڑھنا چاہتا تھا اس لئے طے پایا کہ میں ایل۔ایس۔ای میں داخلہ لوں۔

..........☆☆☆..........

اسکول میں داخلہ

اسکول میں داخلہ کی غرض سے میں شروع ستمبر ۱۹۲۲ء میں لندن روانہ ہوا۔ داخلہ کی آخری تاریخ ۳۰ ستمبر تھی اور پڑھائی یکم اکتوبر سے شروع ہونی تھی۔ ان دنوں اسکول کا عملہ داخلہ کے کام میں مصروف تھا۔ اسکول میں لڑکوں اور لڑکیوں کی مجموعی تعداد تقریباً تین ہزار تھی۔ اتنی بڑی تعداد کے داخلہ میں باقاعدگی، حسنِ انتظام اور طلباء اور طالبات کا ڈسپلن خود آپ اپنی مثال تھا۔ سب سے بڑھ کر یہ بات تھی کہ کسی قسم کا شوروغل بالکل نہ تھا۔ جو طلباء و طالبات کے گھروں اور اسکولوں کی تربیت کا نتیجہ تھا۔ یہاں اس بات کا ذکر دلچسپی کا باعث ہوگا کہ طالب علم اور استاد اسکول کے نئے تعلیمی سال کا کیلنڈر ضرور خریدتے تھے اس میں ہر مضمون کا ٹائم ٹیبل، ہر مضمون کا سلیبس اور اس کے متعلق کتابیں نیز ہر قسم کی اسکول اور یونیورسٹی کی میٹنگ اور ماہرین کے اسکول میں جنرل لیکچرز کے وقت تاریخ اور جگہ لکھے ہوئے تھے اور اس بارے میں مزید نوٹس نکالنے میں وقت ضائع نہیں کیا جاتا تھا۔ جس دن اسکول کھلنا تھا یعنی یکم اکتوبر کو استاد اور شاگرد اسکول پہنچ گئے اور پڑھائی شروع ہوگئی۔ کوئی

نہیں کہہ سکتا تھا کہ کل تک یہاں داخلے ہو رہے تھے۔ اب نہ کوئی داخلہ لینے والا تھا اور نہ کوئی داخلہ دینے والا۔ یہ صورتِ حال دیکھ کر مجھے غالبؔ کے مندرجہ ذیل اشعار یاد آ گئے۔

یا شب کو دیکھتے تھے کہ ہر گوشۂ بساط
دامانِ باغبان و کفِ گل فروش ہے
یا صبح دم جو دیکھیے آ کر تو بزم میں
نَے وہ سرور و شور نہ جوش و خروش ہے

اب ذرا داخلہ کا مرحلہ ہمارے اداروں میں دیکھئے۔ نہ اس کی ابتدا نہ اس کی انتہا۔ اور وہ شور و بدنظمی کہ پناہ بخدا کس قدر افسوس کا مقام ہے۔ آخر یہاں حالت سدھر کیوں نہیں سکتی؟

............☆☆☆............

لندن سکول آف اکنامکس کی عمارت جہاں پروفیسر ایس ایم شفیع نے بی ایس سی (اکنامکس) کی

کچھ اسکول کے بارے میں

ایل ایس ای لندن شہر میں ایک شاہراہ سے ہٹ کر کشادہ سڑک پر واقع ہے اس میں بیسمنٹ اور گراؤنڈ فلور کے علاوہ چار منزلیں ہیں۔ چڑھنے اور اترنے کے واسطے اسٹاف کیلئے لفٹ اور طالبعلموں اور دوسرے عملہ کیلئے سیڑھیاں ہیں۔ ان منزلوں میں کلاس روم، طلبا اور طالبات اور اسٹاف کیلئے الگ الگ نہایت کشادہ کامن روم، اسکول آفس، ہر استاد کیلئے الگ الگ کمرہ، اسکول لائبریری، متعدد بڑے بڑے ہال، اسکول بک شاپ وغیرہ ہیں۔ سب سے اوپر والی منزل پر اسکول کا کیفے ٹیریا اور کچن وغیرہ۔

(۱) بیس منٹ:

بیس منٹ کا بہت زیادہ آرام ہے۔ اسکول میں داخل ہوتے ہی دائیں اور بائیں جانب بیس منٹ میں کلوک روم ہیں۔ ایک طرف مردانہ اور دوسری طرف زنانہ۔ ان میں کوٹ، برساتی، بیگ وغیرہ رکھنے کا انتظام ہے۔ یہاں کا عملہ آپ کی چیزیں کسی ایک نمبر پر رکھ کر ڈپلیکیٹ نمبر آپ کو دیگا۔ چیزیں واپس لینے کی صورت میں وہ نمبر دے کر آپ کی چیزیں مل جائینگی۔ ہر کلوک روم کے برابر ٹائیلٹ روم ہیں جہاں صاف تولیئے سینکڑوں کی تعداد میں رکھے

رہتے ہیں جنہیں استعمال کے بعد لنن باسکٹ میں ڈال دیا جاتا ہے۔

(ب) کامن روم:

کامن روم کا بہت اچھا سلسلہ ہے۔ یہ نہایت عمدہ فرنیچر سے آراستہ ہیں اور یہاں طالب علم ہنسی خوشی سے فرصت کا وقت گزارتے ہیں۔ موسم کے لحاظ سے ان کو گرم رکھنے کا انتظام ہوتا ہے۔ ان میں الفابیٹیکل لیٹر کیبنٹ ہے جس کے ذریعے طلبا خط و کتابت کر لیتے ہیں۔ اکثر اسکول کے سرکاری خط بھی یہیں ملتے ہیں۔ طالب علم اپنے الفابٹ والے خانے میں اپنے خط تلاش کرتے ہیں۔ اگر ہوا تو لے لیا۔ ورنہ اور خطوں سے کوئی سروکار نہیں۔ میں سوچتا ہوں کہ اپنے وطنِ عزیز میں تو ہر ایک کو یہ تشویش ہوگی کہ دیکھیں یار لوگوں میں کیا خط و کتابت ہو رہی ہے!

(ج) کیفے ٹیریا:

کیفے ٹیریا کا بہت آرام ہے وہاں مقررہ اوقات میں صبح کا ناشتہ، دوپہر کا کھانا، تیسرے پہر کی چائے اور رات کا کھانا نہایت عمدہ اور کم قیمت پر ملتا ہے۔ یہ بات قابل ذکر ہے کہ کیفے ٹیریا میں داخل ہوتے ہی کاؤنٹر پر اپنی کرنسی کو اسکول کے چھوٹے رقموں کے کوپن سے بدلانا پڑتا ہے۔ آپ مینو کارڈ دیکھ کر کوئی چیز منگانا چاہیں تو اس کی قیمت کے بقدر کوپن ویٹرس کو دے دیں اور وہ ان کو کچن میں دے کر آپ کی چیز لادے گی۔ جو کچھ بھی کھانا ہو یہی طریقہ اختیار کرنا پڑتا ہے۔ اور یہ سب کیلئے ہے۔ خواہ استاد ہوں یا شاگرد۔ آپ اس کی آسانی اور بچت دیکھئے۔ نہ بل بننے کا سوال ہے نہ چینج لینے دینے کا مسئلہ ہے اور کچن کو بھی سہولت ہے۔

(د) لائبریری:

اسکول کی لائبریری بڑے اعلیٰ پیمانے پر ہے۔ اس میں لاکھوں کتابیں ہیں۔ اور نئی نئی کتابوں کے آنے کا سلسلہ جاری رہتا ہے۔ لائبریری کے کمروں کی تقسیم مضمون کے لحاظ سے ہے۔ مثلاً بنکنگ روم، اکانامک ہسٹری روم وغیرہ وغیرہ۔ جسے جو مضمون پڑھنا ہو وہ اس کمرہ میں جا کر شیلف سے کتاب لیکر پڑھنا شروع کر دیتا ہے۔ لائبریری کے کمروں میں "لاکر" والے میز، قلم، سیاہی اور کاغذ رکھے رہتے ہیں اور پڑھنے والے انہیں استعمال کر سکتے ہیں۔ لائبریری کا ایشوسیکشن بھی ہے جہاں سے کتابیں لی جا سکتی ہیں۔ سب سے بڑھ کر یہ بات ہے کہ لائبریرین نہایت قابل اور ہمدرد انسان ہوتے ہیں اور لائبریری کے سلسلے میں ہر قسم کی مدد کیلئے خندہ پیشانی سے تیار رہتے ہیں۔

(ہ) آمدورفت کی سہولت:

جیسا کہ اوپر بیان کیا جا چکا ہے اسکول لندن شہر میں واقع ہے اور زیادہ تر اساتذہ اور طالب علم اسکول سے کافی دور مضافات میں رہتے ہیں اور جو دس پندرہ، بیس میل اور بعض اوقات اس سے بھی زیادہ فاصلے پر ہوتے ہیں۔ مگر ٹریم، بس اور انڈر گراؤنڈ ٹرین کی اس قدر سہولت ہے کہ اسکول پہنچنے میں کوئی دقت نہیں ہوتی۔ ٹریم اور بس ہر پانچ منٹ بعد ملتی ہیں اور انڈر گراؤنڈ ہر تین منٹ بعد، جب جی چاہے آپ اپنی رہائش گاہ سے قریب والے ٹریم یا بس اسٹینڈ پر یا انڈر گراؤنڈ اسٹیشن پر پہنچ جائیں تو یا تو وہ تیار ملے گی یا صرف چند منٹ ٹھہرنا پڑے گا۔ گاڑیوں میں بھیڑ بھاڑ نہیں ہوتی۔ مقررہ تعداد سے زیادہ نہ کوئی بیٹھتا ہے اور نہ کوئی بٹھاتا ہے۔

☆☆☆

اسکول کا تعلیمی نظام

(ا) جیسا کہ بیان کیا جا چکا ہے اسکول کے کیلینڈر میں ٹائم ٹیبل وغیرہ بڑی تفصیل سے لکھا ہوتا ہے۔ اس کے مطابق وقت مقررہ پر اسٹاف اور اسٹوڈنٹس اپنی اپنی کلاسوں میں پہنچ جاتے ہیں اور پھر دربان دروازہ بند کر دیتا ہے۔ کوئی کلاس بیل نہیں بجتی ہر شخص اپنی گھڑی ہی سے کام لیتا ہے۔ کلاس شروع ہو جانے پر نہ کسی کے آنے کا سوال پیدا ہوتا ہے نہ جانے کا۔ پیریڈ ساٹھ منٹ کا ہوتا ہے۔ استاد کا وقت کلاس کی حاضری لینے میں ضائع نہیں ہوتا۔ ہر کلاس میں اٹینڈنس شیٹ پہلے سے تیار رکھ دی جاتی ہے جس پر تاریخ وقت اور کلاس کا نام درج ہوتا ہے۔ وہ کلاس کے دوران ایک سے دوسرے تک گھومتی رہتی ہے اور طلبا و طالبات باری باری اپنا نام لکھ دیتے ہیں پیریڈ کے بعد دربان اسے رجسٹرار آفس میں جمع کرا دیتا ہے۔ اٹینڈینس شیٹ میں کسی غیر حاضر طالب علم کا نام لکھنے کا سوال ہی نہیں حالانکہ سالانہ امتحان میں شرکت کیلئے پچاسی فیصد حاضری لازمی ہے۔

(ب) مضامین:

ان کی صورت یوں ہے کہ اکنامکس کے مختلف حصے ایک مضمون اور ڈیپارٹمنٹ کی

حیثیت رکھتے ہیں۔ مثلاً اکنامک تھیوری، کرنسی بینکنگ، اکنامک ہسٹری، پبلک فنانس وغیرہ سب الگ الگ ڈیپارٹمنٹ کی حیثیت رکھتے ہیں اور ہر مضمون کیلئے پروفیسر، ریڈر، متعدد لیکچرار اور اسسٹنٹ وغیرہ ہوتے ہیں۔ ظاہر ہے جہاں اتنی زیادہ تفصیل سے پڑھائی کا انتظام ہو وہاں معیار کس قدر بلند ہوگا۔ ڈگری کیلئے کوئی آٹھ مضامین ہوتے ہیں اور ان میں سے کسی ایک مضمون کو اسپیشل سبجیکٹ کے طور پر لینا لازمی ہے۔ اور اس مضمون کو بڑی تفصیل سے پڑھایا جاتا ہے اور ہفتہ میں ایک دن اس میں ٹیٹوریل کلاس ہوتی ہے جس میں سوال جواب ہوتے ہیں اور ہر ایک باری باری ''ایسے'' (Essay) لکھ کر لاتا ہے جو پڑھایا جاتا ہے اور اس پر خوب بحث ہوتی ہے۔

(ج) استاد:

یہ اپنے مضمون میں واقعی استاد ہوتے ہیں اور بڑی تیاری اور وقت کی پابندی سے پڑھاتے ہیں۔ اور جہاں تک مجھے یاد ہے ایسا کبھی نہیں ہوا کہ کوئی استاد دیر سے پہنچے یا غیر حاضر ہو۔ یہی حال طالب علموں کا ہے سردی ہو یا بارش کلاسیں بھری ہوتی ہیں۔ لیکچر کی تعداد نسبتاً کم ہوتی ہے۔ زیادہ تر طالب علم خود ہی لائبریری میں پڑھتے رہتے ہیں۔ چھٹیاں بھی مقرر ہیں، یعنی ایک مہینہ ایسٹر کے موقع پر ایک مہینہ کرسمس کے موقع پر اور تین مہینے گرمیوں میں، ان کے علاوہ سوائے اتوار کے اور کسی قسم کی چھٹی نہیں ہوتی۔

(د) سالانہ امتحان:

ان کا بہت عمدہ انتظام ہوتا ہے ہر اگزامنی کو معلوم ہوتا ہے کہ اس کے پرچے کس دن یا کس وقت اور کس کمرے میں ہوں گے۔ وقت مقررہ پر کمرے کا دروازہ کھلتا اور طالب علم

اپنی اپنی جگہ پر پہنچ جاتے ہیں۔ وہاں امتحان کا پرچہ رکھا ہوتا ہے اور جواب لکھنے کیلئے کاغذ بھی موجود ہوتا ہے۔ طالب علم جواب لکھنے میں مشغول ہو جاتے ہیں اور کاغذ ختم ہونے پر خود ہی اور کاغذ اٹھا لیتے ہیں۔ نقل وغیرہ کوئی سوچ بھی نہیں سکتا۔ کمرے میں ایک انوجیلیٹر ہوتے ہیں جو اخبار یا کوئی اور کتاب پڑھتے رہتے ہیں۔

(ہ) مقصد:

انگلستان میں کچھ ایسی صورت ہے کہ لڑکے اور لڑکیاں میٹرک کے بعد کوئی نہ کوئی کام یا ملازمت اختیار کر لیتے ہیں اور رفتہ رفتہ اس میں ترقی کرتے رہتے ہیں۔ اسکول میں اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کا کوئی مقصد ضرور ہوتا ہے یا ٹیچنگ لائن یا انگلستان کی سول سروس وغیرہ کے مقابلے کا امتحان یا اکنامکس اور پالیٹیکس میں مہارت حاصل کرنے کے بعد کسی پولیٹیکل پارٹی سے منسلک ہونا۔ اس کے علاوہ ایل ایس ای میں کوئی اور مقصد کسی کے سامنے نہیں ہوتا۔

اس کے برعکس بڑے افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ ہمارے تعلیمی ادارں میں طالب علموں کے سامنے کوئی مقصد نہیں ہوتا اور غالباً اسی لئے تعلیم میں کوئی لگن یا دلچسپی نہیں ہوتی۔

............☆☆☆............

اسکول کے متعلق چند واقعات

اب میں اپنے زمانہ میں اسکول کے چند واقعات بیان کرتا ہوں کہ جن سے اسکول کی کارکردگی، تعلیم سے دلچسپی، وقت کی قدر و قیمت اور فرض شناسی کی جھلک سامنے آئیگی۔

(۱) ۱۹۲۶ء میں انگلستان میں ٹرانسپورٹ کا بہت بڑا اسٹرائیک ہوا۔ اور ٹریم بس انڈرگراؤنڈ اور دوسری ٹرینیں چلنا بند ہوگئیں۔ یہ اسٹرائیک کرایہ میں اضافہ کی خاطر ہوا تھا حکومت پبلک کے خیال سے کرایہ میں اضافہ کے خلاف تھی۔ وزیر اعظم نے قوم سے خطاب کیا کہ اگر اسٹرائیک ناکام بنانا ہے تو قوم حکومت کا ساتھ دے اور وہ اس طرح کہ جن کے پاس اپنی موٹریں وغیرہ ہوں وہ اپنے خرچ سے ان سب کو سڑکوں پر لے آئیں۔ اور سب سے پہلے بوڑھی عورتوں کو اور پھر بوڑھے مردوں کو اور اس کے بعد لڑکیوں کو جہاں جہاں اپنے کام کے سلسلے میں جانا ہو پہنچا دیں۔ اور پھر اسی طرح ان کو واپس اپنے گھروں تک پہنچا دیں۔ لڑکوں کو لفٹ دینے کی ضرورت نہیں۔ انہیں پیدل چلنا چاہیے۔ لوگوں نے ان ہدایات پر بڑی تندہی سے عمل کیا۔ جس کے نتیجہ میں اسٹرائیک دوسرے ہی دن ختم ہوگیا۔ مجھے تو کسی لفٹ کی توقع نہیں تھی۔ اسکول دس بارہ میل دور تھا۔ اور یہ بھی خیال تھا کہ

ایسی حالت میں پڑھائی کیا ہوگی۔ خاص کر اس دن لیکچر بھی پروفیسر کینن کا تھا جو آکسفورڈ میں رہا کرتے تھے۔ اور اُن کیلئے لندن پہنچے کا کوئی امکان نہ تھا۔ پھر بھی خیال ہوا کہ اسکول چلنا چاہیے چنانچہ میں پیدل چل پڑا۔ راستے میں کچھ اور ساتھی مل گئے۔ اور ڈھائی تین گھنٹوں میں ہم اسکول پہنچ گئے دیکھتے کیا ہیں کہ پروفیسر کینن انٹرنش ہال میں ٹہل رہے ہیں۔ اور اپنی کلاس کے وقت کا انتظار کر رہے ہیں۔ انہیں دیکھ کر ہمیں بہت تعجب ہوا، پھر سوچا کہ شاید لندن آئے ہوئے ہوں اور یہیں رک گئے ہوں۔ تھوڑی دیر بعد ان کی کلاس کا وقت ہو گیا۔ اور ہم سب کلاس میں داخل ہو گئے لڑکے اور لڑکیاں تقریباً پوری تعداد میں موجود تھے۔ پروفیسر کینن کلاس میں آئے تو سب نے تالیاں بجائیں۔ پروفیسر کینن نے سر ہلا کر شکریہ ادا کیا اور فرمایا کہ لیکچر کے بعد اس کے متعلق کچھ کہوں گا۔ وقت سے پانچ منٹ قبل لیکچر ختم کر کے انہوں نے فرمایا "جب اسٹرائیک شروع ہوا تو مجھے فکر ہوئی کہ اسکول کس طرح پہنچا جائے میری عمر تقریباً ۶۵ سال ہے اور اس مدت میں مَیں نے اپنا لیکچر کا کبھی ناغہ نہیں کیا۔ تو اب یہ دھبہ کیوں لگے۔ میں نے اپنی سائیکل کی صفائی وغیرہ کی اور اندازہ لگایا کہ کتنے میل فی گھنٹہ کی رفتار سے اور کتنی دیر راستہ میں دم لیکر کتنے گھنٹوں میں آکسفورڈ سے لندن تک کوئی ۱۲۵ میل کا فاصلہ طے کر لوں گا۔ چنانچہ اسی حساب سے میں چل پڑا اور لیکچر کے وقت سے کافی پہلے اسکول پہنچ گیا۔ اور خدا کا شکر ادا کیا کہ میں اپنے لیکچر سے غیر حاضر نہیں ہوا۔" اس پر تالیوں سے کلاس روم گونج اٹھا۔ اور پرفیسر کینن نے سر ہلا کر شکریہ ادا کیا۔ اور کلاس سے روانہ ہو گئے۔

(احساس ذمہ داری۔ فرض شناسی)

Sense of Responsiblity

سوچنے کی بات ہے کہ اس سے زیادہ فرض شناسی کی اور کیا مثال ہو سکتی ہے ہمیں اس واقعہ سے سبق سیکھنا چاہیے۔ ہمارے اکثر اساتذہ غیر حاضری کیلئے طرح طرح کے بہانے

ڈھونڈتے رہتے ہیں۔ خدا ہمیں ہدایت دے۔ دو تین مہینے بعد پروفیسر کینن کی عمر ۶۵ سال کی ہوگئی۔ اور وہ پروفیسر آف اکنامک تھیوری سے ریٹائر ہو گئے۔ ان کے ریٹائرمنٹ پر ان کے نامور شاگردوں نے ان کی شان میں ''ایسے'' لکھے جو کہ "London Essays in Economics in honour of Edwin Cannan." کے نام سے ۱۹۲۷ء میں شائع ہوئے اس کے دیباچہ میں پروفیسر کینن کے آکسفورڈ سے لندن بائیسیکل پر آنے کا یہ واقعہ درج ہے۔

(ب) ایل۔ ایس۔ ای کے ڈائریکٹر سر ولیم بیورج کے متعلق معلوم ہوا کہ وہ لندن یونیورسٹی کے وائس چانسلر منتخب ہو گئے ہیں۔ اسکول میں ان کو دیکھ کر سب نے خوشی سے خوب تالیاں بجائیں۔ اور انہوں نے سر ہلا کر شکریہ ادا کیا۔ چند ہفتوں کے بعد معلوم ہوا کہ انہوں نے اس جلیل القدر عہدے سے استعفیٰ دے دیا ہے۔ اور یہ اس لئے کہ اُن کے ریسرچ کے کام میں خلل پڑ رہا تھا۔ یہ وہی بیوریج ہیں جنہوں نے کچھ عرصہ بعد ''بیوریج سوشل سیکیورٹی پلین'' تصنیف کیا اور جن کو حکومت نے بیریج سے نوازا، اور وہ لارڈ بیوریج کے نام سے مشہور ہوئے۔

(ج) جیسا کہ بیان کیا جا چکا ہے یونیورسٹی کے امتحان میں شرکت کیلئے ۸۵ فیصد حاضری لازمی تھی۔ ہم چند طلباء اپنی حاضری دریافت کرنے کیلئے جسٹرار آفس گئے میں نے اپنا نام بتایا اور کہا کہ میں اپنی حاضری دریافت کرنا چاہتا ہوں۔ تھوڑی دیر میں جواب ملا ''ٹھیک ہے'' دوسرے لڑکوں کے ساتھ بھی یہ ہی ہوا البتہ ایک لڑکے کو جواب ملا ''افسوس ہے'' وہ لڑکا تھوڑی دیر کیلئے سکتے میں آگیا۔ پھر سنبھل کر اس نے کہا ''اچھا آئندہ سال''۔ اب ذرا یہاں کے طلباء کی ذہانت دیکھئے کوئی دفتر سے لڑے گا۔ کوئی کس کلرک پر بے ایمانی کا الزام لگائے گا۔ کوئی کہے گا کہ فلاں استاد نے مجھے حاضری نہیں دی غرض اپنی کوتاہی کو نہیں مانے گا۔ اور اس سے بڑھ کر

اس کے والد بزرگوار اور کچھ اور حضرات کوشش کریں گے کہ حاضری کی کمی کے باوجود وہ کسی طرح امتحان میں شریک ہو جائے۔

(د) اکنامک ہسٹری کے مشہور مصنف کنگھم صاحب کی کتاب "Economic Histroy of England" دو جلدوں میں تھی جسے "بگ کنگھم" کہا جاتا تھا۔ اور اسی مضمون پر ان کی ایک چھوٹی کتاب ایک جلد میں تھی جسے "لٹل کنگھم" کہا جاتا تھا ہماری اکنامک ہسٹری کی پروفیسر ان کی شاگرد تھیں۔ انھوں نے کنگھم صاحب کو لیکچر کیلئے ایل۔ ایس۔ ای میں مدعو کیا جلسہ شروع ہونے پر انہوں نے مہمان خصوصی کا اس انداز میں تعارف کرایا۔

"خواتین وحضرات: آپ "بگ کنگھم" سے تو واقف ہیں (اور مہمان خصوصی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے) لیجئے یہ کنگھم ہیں"

اس مختصر اور جامع تعارف کے بعد مہمان خصوصی نے لیکچر شروع کر دیا۔

(ہ) ایک موقع پر ایل۔ ایس۔ ای کے ایک پروفیسر کے انتقال کے سلسلہ میں تعزیت کی میٹنگ تھی۔ وقت مقررہ پر اسٹاف اور سٹوڈنٹس ہال میں جمع ہو گئے اور ایک سینئر پرفیسر نے یوں تقریر کی.......... "خواتین وحضرات: آپ جانتے ہیں کہ ہم یہاں کس لئے جمع ہوئے ہیں۔ مرحوم بڑی صفات کے مالک تھے افسوس: کہ آج وہ ہم میں نہیں ہیں۔ ان کی یاد ہم اس طرح تازہ رکھ سکتے ہیں کہ جس کام میں وہ مشغول تھے اسے ہم جاری رکھیں۔ لہٰذا ہم سب کو اپنی اپنی کلاسوں میں جانا چاہیے.........." اس کے بعد میٹنگ ختم ہوگئی اور کلاسوں میں پڑھائی شروع ہوگئی۔ علامہ اقبالؒ نے کیا خوب فرمایا ہے۔ ؎

قوتِ افرنگ از علم و فن است

از ہمیں آتش چراغش روشن است

..........☆☆☆..........

مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کی ملازمت

۱۹۲۷ء تا ۱۹۴۷ء

یونیورسٹی میں تقرر

میں ابھی لندن ہی میں تھا کہ نومبر ۱۹۲۶ء میں مجھے علی گڑھ کے پرووائس چانسلر (ڈاکٹر سر ضیاء الدین احمد صاحب) کا خط ملا کہ لندن سے واپسی پر میں علیگڑھ آؤں۔ اکنامکس ڈیپارٹمنٹ میں میرے لئے جگہ خالی ہے۔ مجھے اس خط سے بڑی خوشی ہوئی کیونکہ میں علی گڑھ یونیورسٹی ہی میں ملازمت چاہتا تھا۔ میں نے یہ خط اپنے پروفیسر (ڈاکٹر سر تھوڈور گریگوری صاحب) کو دکھایا۔ انہوں نے مجھے مبارکباد دی اور فرمایا کہ تم بڑے خوش نصیب ہو۔

میں شروع دسمبر ۱۹۲۶ء میں ہندوستان واپس آ کر اناؤ پہنچ گیا جہاں میرے والد صاحب سول سرجن تھے انہوں نے مجھے بتایا کہ ان کے پاس علیگڑھ یونیورسٹی کے وائس چانسلر (صاحبزادہ آفتاب احمد خان صاحب) کا خط آیا ہوا ہے کہ جیسے ہی میں اُناؤ پہنچوں وہ مجھے علیگڑھ یونیورسٹی میں ملازمت کیلئے بھیج دیں۔ صاحبزادہ صاحب مجھے یوں جانتے تھے

کہ جب میں لندن میں طالب علم تھا وہ انڈیا کونسل کے ممبر تھے انہیں اکنامکس سے گہری دلچسپی تھی۔ اوران کی خواہش کے مطابق میں ان کے یہاں جایا کرتا تھا اور وہ اکنامکس پر گفتگو کرتے تھے اور لذیذ مغلئی کھانے کھلایا کرتے تھے۔ علیگڑھ جانے کے متعلق والد صاحب نے فرمایا کہ جلدی کیا ہے دو تین ہفتے بعد چلے جانا۔ میں غالباً دسمبر کے تیسرے ہفتے ہی میل ٹرین سے شام چھ بجے علیگڑھ پہنچا۔ دیکھتا کیا ہوں کہ یونیورسٹی افسران (وائس چانسلر پرووائس چانسلر، رجسٹرار پرووٹ پراکٹر وغیرہ) اسٹیشن پر موجود ہیں۔ دریافت کرنے سے معلوم ہوا کہ پبلک سروس کمیشن کے ممبر جو آج صبح یونیورسٹی تشریف لائے تھے اسی میل ٹرین سے واپس دہلی جارہے ہیں اور یونیورسٹی افسران انہیں رخصت کرنے آئے ہوئے ہیں۔ میں بھی وہاں پہنچ گیا۔ مجھے دیکھ کر یونیورسٹی کے حضرات بہت خوش ہوئے۔ وائس چانسلر صاحب نے میرا تعارف پبلک سروس کمیشن کے ممبران سے کرایا کہ میں علیگڑھ کا پرانا طالبعلم ہوں اوراب لندن سے بی ایس سی (اکنامکس) کی ڈگری حاصل کر کے واپس آیا ہوں کمیشن کے انگریز چیئرمین صاحب نے فرمایا کہ مسلمانوں کو ہم سے شکایت ہے کہ ہم مسلمان نوجوانوں کو اچھی ملازمت نہیں دیتے مگر ہم مجبور ہیں اس لیے کہ کوالیفائیڈ مسلمان نہیں ملتے۔ آپ ہم سے دہلی آکر ملیں تو ہم آپ کو اچھی ملازمت دیں گے۔ یہ سنتے ہی صاحبزادہ صاحب اور ڈاکٹر صاحب نے بیک زبان فرمایا کہ ہم تو انہیں یونیورسٹی میں ملازمت دے رہے ہیں چیئرمین صاحب نے میری طرف دیکھا تو میں نے عرض کیا کہ میری تو ہمیشہ سے یہی آرزو تھی کہ اپنی مادر علمی کی خدمت کروں۔ آپ کا بہت بہت شکریہ! مجھے سرکاری ملازمت کی خواہش نہیں۔ میں چند دن علی گڑھ ٹھہرا اور اس عرصہ میں یونیورسٹی نے طے کردیا کہ میں ۲ جنوری ۱۹۲۷ء سے اکنامکس ڈیپارٹمنٹ میں کام شروع کردوں۔

مولانا سلیمان اشرف صاحب میرے شفیق استاد تھے میں نے انہیں بتایا کہ میرا تقرر اکنامکس ڈیپارٹمنٹ میں ہو گیا ہے۔ وہ بہت خوش ہوئے اور فرمایا ''فقیر کی ایک بات یاد رکھو۔ طلباء کا امتحان تو سال میں ایک مرتبہ ہوتا ہے لیکن استاد کا امتحان کلاس میں ہر روز ہوتا ہے'' مجھے ان کی یہ نصیحت اب تک یاد ہے اور میں نے یہی کوشش کی کہ کلاس کے امتحان میں ناکام نہ ہوں۔ اس سلسلہ میں ایک لطیفہ بھی ہوا۔ جس دن میں نے اپنی کلاسوں کو پڑھانا شروع کیا۔ اسی سہ پہر کو میرا اسٹاف کلب جانا ہوا۔ بعض استادوں نے کہا تم نے سنا کہ لڑکے تمہارے متعلق کیا کہتے ہیں؟ میں نے کہا کہ نہیں۔ تو فرمایا کہ وہ کہتے ہیں کہ پڑھایا بہت اچھا اور سوٹ بھی بہت عمدہ پہنا ہوا تھا۔ اس پر خوب ہنسی رہی۔ بات یہ تھی کہ میرے پاس چند سوٹ لندن کے سلے ہوئے تھے۔ جس قسم کا واقعہ اسٹیشن پر پیش آیا تھا ویسا ہی ایک واقعہ اس کے بعد غالباً ۱۹۳۸ء میں پیش آیا۔ میرے لندن کے پروفیسر (سر تھیوڈور گریگوری صاحب) کا تقرر حکومت ہند کے اکنامک ایڈوائزر کی حیثیت سے ہوا۔ وہ ایک دن یونیورسٹی کی دعوت پر علیگڑھ تشریف لائے۔ اور میری درخواست پر میرے یہاں قیام کرنا منظور فرمایا۔ اِدھر اُدھر کی باتوں کے بعد انہوں نے فرمایا کہ میں چاہتا ہوں کہ تم دہلی چلو میں تمہیں اپنے ڈیپارٹمنٹ میں اچھی جگہ دے دوں گا۔ میں خاموش رہا۔ انہوں نے پوچھا کہ تمہارا کیا خیال ہے۔ میں نے کہا کہ میں تو اس قومی ادارے کی خدمت بڑی عزت کا باعث سمجھتا ہوں۔ مجھے اور کہیں ملازمت کی خواہش نہیں۔ میں نے محسوس کیا کہ انہیں یہ بات پسند نہیں آئی اور فرمایا کہ اچھا جیسی تمہاری مرضی۔

.........☆☆☆.........

پریذیڈنٹ فٹ بال کلب

میں اپنی طلب علمی کے زمانے میں کھلاڑی بھی تھا اس لیے ۱۹۲۸ء میں مجھے یونیورٹی فٹ بال کلب کا پریذیڈنٹ مقرر کیا گیا۔ اس زمانہ میں کرکٹ کپٹن کیلئے ایس ایس ایسٹ میں کمرہ نمبر ۱۳ مخصوص تھا اسمیں کرکٹ ٹیم کے سالانہ گروپ اور ہر سال کے کرکٹ الیون کے نام کے بورڈ لگے رہتے تھے۔ یہ بات کسی اور کلب کو حاصل نہ تھی۔ فٹ بال کے کھلاڑی زیادہ تر وی ایم ہال میں رہا کرتے تھے۔ مجھے خیال ہوا کہ کیوں نہ فٹ بال کیپٹن کیلئے ایک کمرہ وی ایم ہال میں مقرر کرایا جائے میری درخواست پر پرووسٹ وی ایم ہال نے ایک موزون کمرہ اس کیلئے مخصوص کردیا۔ فٹ بال کپٹن اور کھلاڑیوں نے اس بات کو بہت پسند کیا۔ اس کمرہ میں فٹ بال ٹیم کے سالانہ گروپ اور ہر سال کے فٹ بال الیون کے نام کے بورڈ لگائے جانے لگے۔ اس سے ایک فائدہ ہوا کہ ہر سال نئے کپٹن کے تقرر پر بورڈ ایک کمرہ سے اتر کر دوسرے کمرہ میں لگائے جانے سے بچ گئے۔ اور اب وہ سب ایک ہی کمرہ میں باقاعدگی سے لگے رہتے تھے۔ اور نیا کپٹن اس کمرہ میں رہائش اختیار کر لیتا تھا۔ میں ۱۹۳۷ء تک فٹ بال کلب کا پریذیڈنٹ رہا۔

............☆☆☆............

پریذیڈنٹ ہاکی کلب

میں اپنے طلب علمی کے زمانے میں ہاکی کا کھلاڑی تھا۔اور دو سال تک ہاکی کیپٹن بھی رہا تھا۔اس لئے غالباً ۱۹۳۷ء میں جب ہاکی پریذیڈنٹ کی جگہ خالی ہوئی تو مجھے اس کلب کا پریذیڈنٹ مقرر کیا گیا۔ظاہر ہے کہ مجھے اس کلب سے بڑی دلچسپی تھی۔اور میں نے چاہا کہ کرکٹ اور فٹ بال کی طرح ہاکی کپٹن کیلئے بھی ایک کمرہ آفتاب ہال میں مقرر کر دیا جائے۔اتفاق ایسا تھا کہ ہاکی کے کھلاڑی زیادہ تر آفتاب ہال میں رہا کرتے تھے پرووسٹ آفتاب ہال نے ایک نہایت عمدہ کمرہ اس کام کیلئے مقرر کر دیا۔اس میں ہاکی ٹیم کے سالانہ گروپ اور ہر سال کی ہاکی الیون کے نام کے بورڈ لگائے جانے لگے۔اس زمانہ میں ہاکی ہندوستان کا خاص کھیل بن چکا تھا۔اور بڑے شہروں میں ٹورنامنٹ ہوتے تھے۔ مثلاً بمبئی میں آغا خان کپ، کلکتہ میں بائیٹن کپ اور لکھنؤ میں رام لال کپ وغیرہ۔آغا خان کپ اور رام لال کپ کے جیتنے والی ٹیم کے کھلاڑیوں کو سونے کے تمغے ملا کرتے تھے اور رنرز اپ کو چاندی کے۔اس زمانہ میں علیگڑھ کی ہاکی ٹیم بہت اچھی ہوتی تھی اور دوسرے شہروں کے ٹورنامنٹ میں شریک ہو کر نہایت عمدہ کھیل کا مظاہرہ کرتی تھی اور کامیابی حاصل کرتی تھی میں ہاکی کلب کا پریذیڈنٹ ۱۹۴۲ء تک رہا۔

یونیورسٹی پراکٹر

۱۹۳۱ء کے شروع میں مجھے یونیورسٹی پراکٹر مقرر کیا گیا۔ اس کی دلچسپ داستان ہے۔ ایک دن پرو وائس چانسلر (مسٹر آر بی ریمس باتھم) نے مجھے اپنے دفتر بلایا اور فرمایا...... ''میں چاہتا ہوں کہ آپ کو یونیورسٹی پراکٹر مقرر کیا جائے امید ہے آپ اس کیلئے رضامند ہوں گے'' میں نے کہا، مجھے سوچنے کی مہلت دیجئے۔ انہوں نے فرمایا: کہ دو تین دن بعد بتلایئے گا۔ میں ان سے تیسرے دن ملا اور کہا کہ یہ عہدہ اچھا ہے۔ اور اس میں خدمت کرنے کا موقع بھی ہے۔ مگر میں اسے قبول نہیں کر سکتا۔ اس لئے کہ پراکٹر کو اکیڈیمک کونسل منتخب کرتی ہے کونسل کے ۳۵۔ ۴۰ ممبر ہیں ہر ایک کے پاس جانا اور پھر ووٹ کی درخواست کرنا اور پھر پراکٹری کے فرائض ادا کرنے میں ان کی خوشنودی کا خیال رکھنا میرے بس کی بات نہیں۔ انہوں نے فرمایا کہ آپ کا خیال صحیح ہے میں اس قاعدے کو بدلوا دوں گا مگر اس میں دیر لگے گی۔ فی الحال میں آپ کو مشورہ دوں گا کہ آپ کسی کے پاس ووٹ کیلئے نہ جائیں میں خود آپ کا تقرر کرا دوں گا۔ میں نے ان کا شکریہ ادا کیا اور کہا کہ میں آپ کے مشورہ پر عمل کروں گا۔ اکیڈیمک کونسل کی میٹنگ میں انہوں نے پراکٹری کیلئے

میرا نام تجویز کیا۔ اور سب نے متفقہ طور پر منظور کر لیا۔ کچھ عرصہ بعد انہوں نے یہ قاعدہ بدلوا دیا۔ نئے قاعدے میں آئندہ پراکٹر کا تقرر پرو وائس چانسلر کی سفارش پر ایگزیکٹو کونسل کیا کرے گی۔

پراکٹری کے فرائض بہت اہم تھے۔ اور میں نے اس کام میں بہت دلچسپی لی اس زمانہ میں یونیورسٹی پراکٹر اور پرووسٹ سر سید ہال کے دفاتر ایس ایس ایسٹ کے ایک ایک کمرہ میں پاس پاس تھے۔ کچھ عرصہ بعد جب ایس ایم ایسٹ کے وہ کمرے خالی ہوئے جن میں مولانا سلیمان اشرف صاحب مقیم تھے تو میں نے چاہا کہ وہ پراکٹر کو مل جائیں۔ اور پرووسٹ سر سید ہال نے کوشش کی کہ وہ انہیں مل جائیں۔ اس عمارت میں متعدد کمرے تھے۔ کچھ ایس ایس ہال کے اندر کھلتے تھے اور کچھ باہر سڑک کی طرف پرو وائس چانسلر صاحب نے فیصلہ کیا کہ اندر کی جانب کے کمرے پرووسٹ سر سید ہال کے دفتر کیلئے ہو جائیں اور باہر کی جانب کے کمرے پراکٹر کے دفتر کیلئے، چنانچہ ایسا ہی ہو گیا۔ پراکٹر کا خاص کام ہوسٹل اور کلاس روم کے باہر طلباء میں ڈسپلن سے متعلق تھا۔ اس سلسلہ میں کچھ نہ کچھ قصے تو رہا ہی کرتے تھے۔ ان کا کہاں تک بیان کیا جائے۔ میں چند واقعات لکھتا ہوں جن سے پراکٹری کے کام پر اور یونیورسٹی کے وقار پر روشنی پڑے گی۔

(ا) علی گڑھ ایک چھوٹا سا شہر ہے اور یونیورسٹی کے علاوہ کوئی خاص دلچسپی کی جگہ بھی نہیں ہے۔ طلباء جب یونیورسٹی سے باہر جاتے تو زیادہ تر ریلوے اسٹیشن چلے جاتے تھے۔ اور تھوڑی دیر پلیٹ فارم پر چکر لگا کر یونیورسٹی واپس آ جاتے تھے۔ ریلوے اسٹاف اور طلباء کے درمیان کچھ نہ کچھ مسئلہ ہوتا رہتا تھا مثلاً ریلوے چاہتی تھی کہ لڑکے پلیٹ فارم ٹکٹ خریدیں اور لڑکے اس کیلئے تیار نہیں ہوتے تھے۔ ریلوے اسٹاف لڑکوں سے الجھنا بھی نہیں چاہتا تھا۔ اور

ان کی خواہش تھی کہ پراکٹوریل اسٹاف ہی لڑکوں سے نپٹا کرے میں نے ریلوے حکام کو مشورہ دیا کہ وہ پلیٹ فارم پر ایک کمرہ پراکٹوریل اسٹاف کیلئے مخصوص کر دیں۔ تا کہ خاص خاص ٹرینوں کے اوقات میں پراکٹوریل مانیٹر اور پراکٹوریل اسسٹنٹ وہاں موجود رہیں اور لڑکوں کے قصے نپٹاتے رہیں۔ چنانچہ ریلوے نے ایک کمرہ اس کام کیلئے مخصوص کر دیا۔ جو پنکھا روشنی اور فرنیچر سے آراستہ تھا۔ اس کے بعد اسٹیشن پر لڑکوں کا معاملہ پراکٹوریل اسٹاف سے رہتا تھا۔ اور ریلوے اسٹاف کو لڑکوں سے جو شکایت ہوتی وہ پراکٹوریل اسٹاف سے رجوع کرتے تھے۔ اسٹیشن کے علاوہ شہر میں بھی اگر لڑکوں کا کوئی قصہ ہوتو پولیس براہ راست مداخلت نہیں کرتی تھی اور پراکٹوریل اسٹاف ہی لڑکوں سے نبٹتا تھا۔

(ب) ایک دفعہ علی گڑھ میں انگلستان سے ہوائی جہازوں کی پارٹی آئی۔ وہ نمائش کے میدان میں ''جوائے رائڈ'' دینا چاہتے تھے طلباء کے سلسلے میں وہ مجھے ملے۔ تو میں نے کہا کہ طلبا کیلئے کنسیشن ریٹ ہونا چاہیے۔ وہ اس پر راضی ہو گئے اور لڑکوں کو اس سے مطلع کر دیا گیا۔ چنانچہ لڑکے کافی تعداد میں جوائے رائڈ کیلئے پہنچ گئے۔ ہوئی جہاز والوں نے طلباء کو کنسیشن دینے سے انکار کر دیا۔ اور کہا کہ طلباء کو ٹکٹ کے پورے دام دینے ہوں گے باوجود کہنے سننے کے وہ نہ مانے۔ تو لڑکوں نے ان کی خوب پٹائی کر دی۔ ہوئی جہاز والوں نے ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ سے شکایت کی۔ ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کو پولیس کے ذریعے اس واقعہ کی اطلاع مل چکی تھی۔ انہوں نے ہوائی جہاز والوں سے کہا کہ تم نے لڑکوں کے ساتھ دھوکا کیوں کیا اب بہتر یہ ہے کہ تم علیگڑھ سے فوراً چلے جاؤ۔ ورنہ ممکن ہے کہ لڑکے تمہارے ہوائی جہازوں کو آگ لگادیں۔ وہ لوگ فوراً علی گڑھ سے روانہ ہو گئے۔

(ج) یونیورسٹی مارکیٹ میں ایک سنیما تھا جس سے طلباء کو بھی آسانی تھی کہ سنیما

دیکھنے شہر نہیں جانا پڑتا تھا۔ ایک دن سینما منیجر اور یونیورسٹی کے ایک طالب علم میں کچھ جھگڑا ہو گیا۔ لڑکا کمزور تھا۔ سینما منیجر نے اس کی پٹائی کر دی جب یہ خبر لڑکوں تک پہنچی تو ان کو یہ بات بہت بُری لگی اور یہ کہ اگر لڑکے سے شکایت تھی تو پراکٹوریل اسٹاف سے رپورٹ کرنی چاہیے تھی۔ کچھ لڑکے سینما منیجر کی مزاج پرسی کیلئے آمادہ ہو گئے۔ سینما منیجر کو جو اس کا علم ہوا تو وہ اتنا خوفزدہ ہوا کہ علیگڑھ سے باہر چلا گیا۔ بہر حال سینما طلباء کیلئے ''آوٹ آف باؤنڈس'' کر دیا گیا۔ اور سینما کو یونیورسٹی مارکٹ سے چلے جانا پڑا۔

(د) یونیورسٹی اسکول کے ہیڈ ماسٹر (مسٹر جی وڈس) نے مجھے لکھا کہ ایک دکاندار نے ان کو سخت پریشان کر رکھا ہے وہ اسکول کے لڑکوں کو سگریٹ بیچنے سے باز نہیں آتا۔ انہوں نے چپراسی کے ذریعہ منع کروایا مگر اس پر کچھ اثر نہیں ہوا۔ انہوں نے چند دنوں بعد اس چپراسی کو دوبارہ بھیجا تو دکاندار نے چپراسی کی پٹائی کر دی۔ لہٰذا وہ چاہتے ہیں کہ میں ان کی مدد کروں۔ میں نے پراکٹوریل اسسٹنٹ کے ذریعہ اس دکاندار کو بلوایا اور سمجھانے کی کوشش کی مگر وہ سخت ضدی ثابت ہوا۔ اس لئے میں نے اس کو کہا کہ تمہاری دکان یہاں سے ہٹا دی جائیگی۔ اور میں نے چیئرمین ڈسٹرکٹ بورڈ کو لکھا کہ ایسے دکاندار کو یونیورسٹی ایریا سے ہٹا دیا جائے۔ اس دکاندار کا بھائی کچہری میں منشی تھا۔ دکاندار نے یہ سب کچھ اس کو بتایا۔ وہ مقدمہ باز تو تھا ہی اس نے بھائی کی طرف سے پرووائس چانسلر صاحب کو درخواست دی کہ میں ایک غریب دکاندار ہوں پراکٹوریل اسسٹنٹ مجھ سے مفت سگریٹ مانگتے ہیں اور تنگ آکر جب میں نے انکار کر دیا تو انہوں نے مجھ کو خوب مارا اور پراکٹر صاحب سے میری شکایت کر دی۔ پراکٹر صاحب نے مجھے بلوایا میری کچھ شنوائی نہیں کی اور میری دکان یہاں سے ہٹوا رہے ہیں۔ حضور انصاف کریں۔ پرووائس چانسلر صاحب نے وہ درخواست مجھے بھیج دی اور یہ کہ اس سلسلہ میں ان سے ملوں۔ میں نے مسٹر وڈس کا خط اپنی

جیب میں رکھ لیا اور پرووائس چانسلر صاحب سے ملنے گیا۔ انہوں نے مجھے سمجھانے کی کوشش کی کہ غریب دکاندار پر اتنی سختی نہیں کرنی چاہیے اور پراکٹوریل اسسٹنٹ کو مفت سگریٹ نہیں لینے چاہئیں اور یہ کہ انصاف ہونا چاہیے۔ میں سنتا رہا اور جب وہ سب کچھ کہہ چکے تو میں نے مسٹر وڈس کا خط انہیں دیا۔ اس کو پڑھ کر وہ سکتے میں آگئے۔ اور کہا کہ یہ دکاندار سخت جھوٹا ہے اور اس کی دکان یونیورسٹی ایریا سے ہٹ جانی چاہیے چند دن بعد چیئرمین ڈسٹرکٹ بورڈ نے اس کی دکان یہاں سے ہٹوادی۔

(ہ) علیگڑھ کی سالانہ نمائش کے موقع پر ڈسٹرک مجسٹریٹ کا دربار ہوا کرتا تھا۔ دربار میں یورنیورسٹی افسران کیلیئے جگہ مخصوص کی جاتی تھی مگر یونیورسٹی سے سوائے پراکٹر کے اور کوئی نہیں جاتا تھا۔ ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ نے مجھ سے پوچھا کہ یونیورسٹی کے حضرات کیوں نہیں آتے۔ میں نے کہا کہ دربار دن کے دس بجے ہوتا ہے میں تو پراکٹر ہونے کی وجہ سے آجاتا ہوں مگر اور حضرات اپنے اپنے ڈیپارٹمنٹ میں مشغول ہوتے ہیں۔ انہوں نے پرووائس چانسلر صاحب کو لکھا کہ دربار کے موقع پر یونیورسٹی میں چھٹی ہونی چاہیے۔ پروائس چانسلر صاحب نے ان کو جواب دیا کہا آپ کو معلوم ہونا چاہیے کہ یہ یونیورسٹی ہے نہ کہ آپ کی چونگی کا اسکول۔ یونیورسٹی ایسے کاموں کیلیئے بند نہیں کی جاسکتی۔

ان واقعات سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان دنوں یونیورسٹی اور اس کے طلباء کو کس قدر اہمیت حاصل تھی۔ میں نے کافی مدت پراکٹری کی اور ۱۹۴۳ء میں جب میرے تقرر کی مدت ختم ہوئی تو میں اس عہدے سے سبکدوش ہوگیا۔

............☆☆☆............

اسسٹنٹ کیپر ڈیوٹی سوسائٹی

۱۹۴۴ء میں مجھے ڈیوٹی سوسائٹی (انجمن الفرض) کا اسسٹنٹ کیپر مقرر کیا گیا۔ یہ سوسائٹی ۱۸۹۰ء میں قائم کی گئی تھی۔ اور اس کا مقصد مستحق طلباء کی قرض حسنہ سے امداد کرنا تھا۔اس سلسلہ میں سوسائٹی ہر سال موسم گرما کی چھٹیوں میں طلباء کے وفود ملک کے مختلف حصوں میں چندہ کی غرض سے بھیجتی تھی۔ یہ وفود اپنا خرچ نکال کر آٹھ دس ہزار روپیہ سوسائٹی کو لادیا کرتے تھے۔جس سے طلباء کو قرض حسنہ ملتا رہتا تھا۔ مجھے خیال ہوا کہ سوسائٹی اتنی طویل مدت سے قائم ہے اور ابھی تک اس کی آمدنی چندہ ہی پر منحصر ہے۔ایسا کیوں نہ ہو کہ سوسائٹی کا اپنا سرمایہ ہو کہ اگر چندہ کم ملے یا نہ ملے تو بھی اس کا مفید کام جاری رہے۔اس خیال کے پیش نظر میں نے چند ہونہار طلباء کو آمادہ کیا کہ آئندہ وکیشن میں زیادہ سے زیادہ چندہ لانے کی کوشش کریں۔ مجھے خوشی ہے کہ ان باہمت لڑکوں نے بڑی جانفشانی سے کام کیا اور تقریباً دو لاکھ روپیہ جمع کر دیا۔میری تجویز تھی کہ اس رقم سے کوئی ہوسٹل تعمیر کیا جائے وائس چانسلر صاحب نے اس تجویز کو پسند کیا اور طے پایا کہ سوسائٹی ایک دو منزلہ ہوسٹل ''صاحب باغ'' میں بنوائے۔ یہ ہوسٹل ڈیڑھ سال میں تعمیر ہو گیا۔ اور اس کا نام ''سر شاہ سلیمان

انجینئرنگ ہال'' رکھا گیا۔ اس کے کمروں کے کرایہ سے تقریباً بارہ ہزار روپیہ سالانہ وصول ہوتا ہے۔ یہ عمارت ۱۹۴۷ء میں مکمل ہوئی۔ تقسیم ہند کے بعد جو حالات رونما ہوئے ان میں چندہ جمع کرنے کا کوئی سوال ہی نہ تھا۔ اس لئے ان ہوسٹل کی تعمیر اور اس کے کرایہ کی آمدنی ایک نعمت ثابت ہوئی۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ من جانب اللہ بات تھی۔ میں ۱۹۴۹ء میں اس عہدہ سے سبکدوش ہوا۔

............☆☆☆............

صدر شعبہ کامرس

۱۹۴۵ء میں یونیورسٹی نے شعبہ کامرس قائم کیا اور مجھے اس کا پہلا صدر مقرر کیا۔ اور خواہش کی کہ میں اس نئے ڈیپارٹمنٹ کو پروان چڑھاؤں۔ خدا کا شکر ہے کہ میرے ریٹائرمنٹ تک اس ڈیپارٹمنٹ نے خاصی ترقی کے مدارج طے کئے۔ کلاسوں کے لحاظ سے آئی کام کے علاوہ بی کام اور ایم کام تک کی پڑھائی ہونے لگی۔ طلباء کی تعداد ۶۰۰ (چھ سو) تک پہنچ گئی۔ آرٹس فیکلٹی کے کسی اور ڈیپارٹمنٹ میں طلباء کی اتنی تعداد نہ تھی۔ عمارت کے لحاظ سے صدر کے کمرے کے علاوہ ایک ''بڑا آڈیٹوریم'' ایک کشادہ ڈیپارٹمنٹل لائبریری و ریڈنگ روم، ایک ٹیوٹوریل روم، ایک ٹائپنگ کلاس روم، دو لیکچر ہال اور ایک جدید قسم کا ٹائیلٹ روم تھا۔ طلباء کی بڑھتی ہوئی تعداد کے پیش نظر دوسری منزل پر دو اور لیکچر ہال تعمیر کرائے گئے اساتذہ کی تعداد رفتہ رفتہ بارہ تک پہنچ گئی۔ طلباء کی سرگرمیوں کا کامرس سوسائٹی میں اہم مقام تھا۔ اور یہ ڈیبیٹ اور جنرل لیکچر کی متعدد میٹنگز کے علاوہ ہر سال ایک ''جرنل آف کامرس'' نکالا کرتی تھی۔ اور طلباء سالانہ اسٹڈی ٹور کے سلسلہ میں کانپور لکھنؤ، بمبئی وغیرہ جایا کرتے تھے۔ میرے زمانہ میں کامرس ڈیپارٹمنٹ آرٹس فیکلٹی سے ملحق تھا۔ میں ۱۹۵۸ء کے وسط میں صدر ڈیپارٹمنٹ آف کامرس کے عہدے سے ریٹائر ہوا۔ اب معلوم ہوا ہے کہ یونیورسٹی نے ایک علیحدہ فیکلٹی آف کامرس قائم کر دی ہے۔

پرووسٹ سرسید ہال

۱۹۴۶ء میں مجھے سرسید ہال کا پرووسٹ مقرر کیا گیا۔ یہ ہال یونیورسٹی کے دوسرے ہالوں سے بہت بڑا تھا۔ مجھے یہ ہال خاص طور سے پسند تھا کہ میں طالبعلمی کے زمانے میں یہیں رہا کرتا تھا۔ اس ہال میں چار ہوسٹل تھے۔ سرسید ایسٹ، سرسید ویسٹ، عثمانیہ ہوسٹل اور سید محمود ہوسٹل۔ ان میں طلبہ کی مجموعی تعداد چھ سو کے قریب تھی۔ اس ہال میں زیادہ تر کھاتے پیتے اور کھیلوں کے شوقین طلباء رہا کرتے تھے اور ان میں آپس میں کچھ نہ کچھ جھگڑے ہوتے رہتے تھے۔ پرووسٹ کا عہدہ سنبھالنے کے بعد میں نے سوچا کہ سب سے پہلے اس مسئلہ کی طرف توجہ دوں تا کہ ہال کی فضا اور کاموں کیلئے ہموار ہو جائے۔ میں نے وارڈن صاحبان سے درخواست کی کہ وہ اپنے اپنے ہوسٹلوں کے مختلف قسم کے نمایاں لڑکوں کو پرووسٹ کی طرف سے چائے پر مدعو کریں۔ اور خود بھی اس میں شریک ہوں۔ تقریباً اسی لڑکے جمع ہو گئے۔ جب چائے ختم ہوئی تو میں نے طلباء سے کہا کہ وہ مجھے ہال کے متعلق اپنی ضرورت سے آگاہ کریں۔ لڑکوں نے بہت سے باتیں بتائیں اور ہیڈ کلرک صاحب ان کو لکھتے گئے۔ اس کے بعد میں نے لڑکوں سے کہا کہ اگر وہ چاہتے ہیں کہ میں ان ضروریات کی

طرف توجہ دوں تو وہ مجھے اس کی حمایت بھی دیں اور اگر جھگڑے فساد ہوتے رہے تو میرا وقت ان میں خراب ہوگا اور یہ سب ضرورتیں رہ جائیں گی۔ لڑکوں نے بیک زبان کہا کہ ہال میں اب کوئی جھگڑے فساد نہیں ہوں گے آپ ان ضروریات پر توجہ دیں۔ علیگڑھ کے طلباء کی یہ خاص بات تھی کہ وہ اپنی بات کے پکے اور اپنے وعدے کے سچے ہوتے تھے۔ اسلئے ان کے آپس کے جھگڑے حقیقت میں ختم ہوگئے اور میں نے ان کی بتائی ہوئی ضروریات کو پورا کرنا شروع کردیا۔ میری خواہش تھی کہ ہال میں پڑھنے والے طلبہ کی تعداد میں اضافہ ہو اور اس غرض سے میں نے فرسٹ ڈویژن کے ضرورت مند طلبہ کیلئے وظائف مقرر کردیئے اور ایسے طلبہ کافی تعداد میں اس ہال میں آگئے اور اس طرح ہال میں ایک متوازن صورت بن گئی۔ ہال میں کامن روم قائم کیا گیا جو طلبہ میں بہت مقبول ہوا۔ ۱۹۴۷ء میں ملک تقسیم ہوگیا اور اس کے بعد حالات کچھ بدل گئے۔

مسلم یونیورسٹی علیگڑھ کی ملازمت

۱۹۴۷ء تا ۱۹۵۸ء

جب اگست ۱۹۴۷ء میں ملک تقسیم ہوا تو میں صدر شعبہ کامرس کے علاوہ سرسید ہال کا پرووسٹ بھی تھا۔ تقسیم کے بعد کچھ ایسی صورت ہوگئی کہ گویا مسلمانوں کو ہندوستان سے کوئی سروکار ہی نہیں۔ ہندو قوم ہر چیز پر چھا جانا چاہتی تھی اور بڑی تنگ نظری اور تنگ دلی کا ثبوت دے رہی تھی علیگڑھ خاص طور سے ان کی توجہ کا مرکز بن گیا تھا یعنی اس کا نام بجائے علیگڑھ کے رام گڑھ ہو جانا چاہیے اردو کی جگہ ہندی ہو جانا چاہیے وغیرہ وغیرہ۔ حکومت کو خیال ہوا کہ بنارس ہندو یونیورسٹی سے لفظ ہندو ہٹا دینا چاہیے تاکہ علیگڑھ مسلم یونیورسٹی سے لفظ مسلم ہٹا دیا جائے۔ بنارس کی مخالفت سے نقطہ نہ ہٹ سکا اور اس لئے علیگڑھ مسلم یونیورسٹی کے نام میں بھی تبدیلی نہیں ہوئی مگر یونیورسٹی خود افراتفری کا شکار بن گئی تھی طلبہ اور اساتذہ کی کافی تعداد پاکستان جانے کیلئے تیار تھی۔ میں نے اپنے متعلق طے کیا کہ ریٹائر ہونے تک علیگڑھ میں رہنا چاہیے۔ مجھے خوشی ہے کہ میری بیگم نے اس سے اتفاق کیا اور ہم

علیگڑھ میں رکے رہے۔ جب میں نے وائس چانسلر صاحب کو یہ بات بتائی تو انہیں تعجب بھی ہوا اور خوشی بھی۔ اساتذہ میں سے کچھ ساتھی جو میری طالب علمی کے زمانہ میں اسٹاف پر تھے سب نے کہا کہ یہ غلط فیصلہ ہے۔ اگر پاکستان جانا ہے تو ابھی چلے جاؤ اور ہندوستان میں رکنا ہے تو پھر پاکستان جانے کا خیال ترک کر دو اور وجہ یہ بتائی کہ میری ریٹائرمنٹ میں ابھی بارہ سال ہیں اور اتنی مدت کے بعد پاکستان جانے پر نہ نیشنیلٹی ملے گی اور نہ کوئی ملازمت۔ میں نے کہا دیکھا جائے گا ہم تو ریٹائر ہونے تک یہیں رہیں گے۔

تقسیم کے بعد طلبہ میں ایک ہیجانی کیفیت پیدا ہو گئی تھی اور وہ اک کشمکش میں مبتلا ہو گئے تھے۔ میں نے سوچا کہ ہال میں غیر نصابی سرگرمیاں بڑھائی جائیں تا کہ طلباء میں سکون اور دل لگی پیدا ہو۔ کامن روم تو قائم ہو چکا تھا۔ اب کھیلوں کی تعداد بڑھائی گئی۔ ڈبیٹنگ سوسائٹی اور ڈرامیٹک کلب کا اضافہ ہوا وہاں میگزین جاری ہوا۔ ہال میں سالانہ ڈنر کی رسم ڈالی گئی۔ ہال میں تو کامن روم قائم ہو چکا تھا مگر اس کیلئے جگہ کی کمی محسوس ہو رہی تھی۔ اس سلسلہ میں وائس چانسلر (نواب اسمٰعیل خان صاحب) نے پراکٹر آفس ہال کامن روم کو دے دیا اور پراکٹر آفس کو نیو ہوسٹل کے چند کمروں میں منتقل کر دیا۔ اب ہال کامن روم کافی کشادہ ہو گیا اور طلباء کی سرگرمیوں کا مرکز بن گیا۔ ان کوششوں سے سرسید ہال میں پھر زندگی کے آثار نمایاں ہونے لگے۔

دوبارہ یونیورسٹی پراکٹر

۱۹۴۹ء میں جب پرووسٹ سرسید ہال کی میعاد ختم ہوگئی تو نئے وائس چانسلر (ڈاکٹر ذاکر حسین خان صاحب) نے فرمایا کہ میں دوبارہ پراکٹر کا عہدہ سنبھال لوں۔ میں نے ہر چند کہا کہ پراکٹر تو میں کافی مدت رہ چکا ہوں مگر انہوں نے اصرار کیا کہ میرا اس وقت پراکٹر ہونا بہت ضروری ہے۔ مجھے ان کی خواہش پوری کرنی پڑی۔ ان دنوں پراکٹر کا دفتر اچھی جگہ نہ تھا۔ میں نے وائس چانسلر صاحب سے کہا کہ اگر آپ مجھے پراکٹر بنانا ہی چاہتے ہیں تو اس کیلئے کوئی مناسب دفتر ہونا چاہیے۔ انہوں نے فرمایا کہ آپ جگہ تجویز کریں۔ میں نے اولڈ بوائز لاج کے قریب جو عمارت کبھی اسٹاف کلب ہوتی تھی تجویز کی۔ انہوں نے اسے منظور کرلیا۔ مجھے یہ جگہ اس لیے پسند تھی کہ یہ یونیورسٹی کے شہر والے گیٹ کے قریب تھی اور کامرس ڈیپارٹمنٹ کے نزدیک تھی۔ میں نے اس عہدے کو قبول تو کرلیا مگر تقسیم کے بعد اس کی پہلی حالت نہیں رہی تھی۔ ریلوے حکام نے اسٹیشن پر پراکٹر کا کمرہ ختم کردیا تھا کہ ریلوے اسٹاف خود لڑکوں سے نپٹ لے گا۔ ضلع کے ہندو افسران بھی یونیورسٹی کی اہمیت کم کرنا چاہتے تھے اور اپنا دبدبہ بڑھانا چاہتے تھے اس سلسلہ میں چند مثالیں حسب ذیل ہیں:۔

(۱) بھارت کے گورنر جنرل (شری راجگو پال اچاری) یونیورسٹی تشریف لانے والے تھے۔ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ نے خواہش کی کہ میں ان سے مل کر بتاؤں کہ اس سلسلہ میں یونیورسٹی کیا انتظامات کر رہی ہے۔ میں ان سے ملا۔میں نے بتایا کہ اپنی روایات کے مطابق یونیورسٹی پراکٹوریل اسٹاف یونیورسٹی حدود میں پولیس کے فرائض انجام دے گا اور کچھ سی آئی ڈی اور پولیس کے حضرات سادہ لباس میں موجود رہیں گے۔انہوں نے فرمایا کہ یہ تو کافی نہیں۔ضلع کی پولیس یونیفارم میں یونیورسٹی کے اندر اپنے فرائض انجام دے گی۔میں نے کہا کہ یہ تو ایک نئی بات ہوگی اور یونیورسٹی اسے پسند نہیں کرے گی اور طلباء اس پر احتجاج کریں گے اور ان کے اور پولیس کے درمیان تصادم کا احتمال ہے۔انہوں نے کہا کہ لڑکوں کو آپ سنبھالیں پولیس یونیفارم میں ضرور رہے گی۔ میں نے ہر چند سمجھانے کی کوشش کی مگر وہ نہ مانے۔ میں نے مجبوراً کہا کہ ایسی صورت میں طلباء کی ذمہ داری میں نہ لے سکوں گا۔اور بہتر ہوگا کہ گورنر جنرل یونیورسٹی تشریف نہ لائیں بہر حال میں اس بارے میں وائس چانسلر صاحب سے گفتگو کرتا ہوں۔انہوں نے فرمایا کہ ٹھیک ہے اور آپ ان سے میری طرف سے کہہ دیں کہ یونیورسٹی میں پولیس یونیفارم میں ضرور رہے گی۔ میں نے وائس چانسلر صاحب کو یہ سب داستان سنائی اور کہا کہ اگر ایسا ہوا تو لڑکے ضرور ہنگامہ کریں گے اور یونیورسٹی افسران کے متعلق بھی کہیں گے کہ ایسی بات کیوں ہونے دی۔انہوں نے پوچھا کہ پھر کیا کرنا چاہیے۔ میں نے مشورہ دیا کہ آپ گورنر جنرل صاحب سے ٹیلیفون پر گفتگو کریں اور ان کو اس صورت حال اور اس کے نتیجہ سے آگاہ کریں۔شیری راجگو پال اچاری نہایت سمجھ دار انسان تھے انہوں نے اس معاملہ کی نزاکت سمجھ کر فرمایا کہ وہ یونیورسٹی آئیں گے اور یونیورسٹی کی روایات کا احترام کیا جائے گا۔ چنانچہ حکومت نے اس بارے

میں احکامات جاری کر دیئے ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ تو اس فیصلہ سے خوش نہیں ہوئے مگر گورنر جنرل جناب کی وزٹ نہایت کامیاب رہی۔

(ب) ایک دفعہ علیگڑھ کے پولیس کپتان صاحب نے سب انسپکٹر کے ذریعہ مجھے کہلایا کہ وہ ایک لڑکے کا داخلہ کرانا چاہتے ہیں۔ یونیورسٹی میں سکالر کا داخلہ پراکٹر کیا کرتے ہیں۔ میں نے سب انسپکٹر سے کہا کہ ایک مہینہ ہوا کہ داخلے ختم ہو چکے ہیں۔ آپ کپتان صاحب کو میری طرف سے یہ ہی کہہ دیں۔ تھوڑی دیر بعد مجھے کپتان صاحب کا فون آیا کہ ایسی کیا بات ہے آپ میرے کہنے سے اس لڑکے کا داخلہ کر دیں۔ میں نے کہا کہ میں آپ کے کہنے پر عمل کروں یا یونیورسٹی قواعد کی پابندی کروں۔ انہوں نے کہا کہ میں اس کا داخلہ وائس چانسلر صاحب سے کہہ کر کرواؤں گا۔ میں نے یہ بات وائس چانسلر صاحب کو بتلائی اور کہا کہ اگر اس قسم کی بے قاعدگیاں ہوتی ہیں تو میں پراکٹری سے باز آیا۔ انہوں نے فرمایا آپ اطمینان رکھیں ایسا نہیں ہوگا۔ چند دنوں بعد ایک فنکشن میں میری کپتان صاحب سے ملاقات ہوئی تو انہوں نے کہا کہ آپ بڑے زبردست آدمی ہیں۔ میں نے کہا کیسے؟ کہنے لگے کہ میں اس لڑکے کے داخلہ کے متعلق وائس چانسلر صاحب سے ملا تھا وہ بڑی خاطر مدارات سے پیش آئے میں نے سمجھا کہ کام بن جائے گا۔ جب میں نے داخلہ کے متعلق گفتگو کی تو انہوں نے فرمایا کہ پراکٹر قاعدہ کے پابند ہیں میں ان سے بے قاعدہ بات کرنے کو کیسے کہہ سکتا ہوں۔

(ج) علیگڑھ کی سالانہ نمائش کے سلسلہ میں ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ صاحب نے نمائش کمیٹی کی میٹنگ بلائی۔ یونیورسٹی نمائندے کی حیثیت سے میں نے بھی شرکت کی۔ نمائش کے پروگرام کے سلسلے میں ڈی ایم صاحب نے فرمایا کہ مشاعرہ نہیں ہونا چاہیے۔ اس میں

بے حد خلقت جمع ہو جاتی ہے شور و غل بہت مچتا ہے اور بڑی بد نظمی ہوتی ہے۔ حاضرین نے اس تجویز کی پرزور تائید کی۔ مجھ سے نہ رہا گیا۔ میں نے دریافت کیا کہ شکایت مشاعرہ سے ہے یا اس کے انتظام سے؟ ڈی ایم صاحب نے فرمایا کہ شکایت مشاعرہ سے نہیں بلکہ اس کے انتظام سے ہے۔ میں نے کہا کہ پھر اس کے انتظام کی طرف توجہ کیجئے۔ انہوں نے طنزے فرمایا کہ آپ انتظام سنبھال لیجئے میں نے کہا کہ میں یونیورسٹی طلباء کی حد تک ذمہ داری لے سکتا ہوں اوروں سے مجھے کیا مطلب وہ آپ کا کام ہے۔ انہوں نے مشاعرہ کمیٹی کا مجھے بھی ممبر بنا دیا اور کہا کہ کمیٹی مشاعرہ کے انتظام کے متعلق سفارشات کرے۔ کمیٹی نے میری رائے سے اتفاق کرتے ہوئے سفارش کی کہ یونیورسٹی طلباء کیلئے مشاعرہ میں ایک الگ بلاک کر دیا جائے۔ اور اس طرح شہر کے دوسرے اداروں اور نیز پبلک کیلئے بھی، تا کہ پتہ چل سکے کہ بد نظمی کا ذمہ دار کون ہے:

میں نے یونیورسٹی کے سینئر طلباء کی میٹنگ کی اور یہ سب کیفیت بتائی۔ انہوں نے یقین دلایا کہ ان کی طرف سے کسی قسم کی بد نظمی اور شور و غل نہیں ہوگا۔ مجھے اطمینان ہو گیا کیونکہ علیگڑھ کے طلباء جو وعدہ کرتے ہیں اس پر قائم رہتے ہیں۔ مشاعرہ اپنے مقررہ دن اور وقت پر شروع ہوا۔ یو پی کے ایک وزیر چوہدری چرن سنگھ مہمان خصوصی تھے۔ وہ اور شہر کے ممتاز حضرات ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ اور میں بھی شعرا کے ساتھ ڈیس پر بیٹھے تھے۔ پہلے شاعر نے شعر سنانے شروع کیے اور طلباء بالکل خاموشی سے شعر سنتے رہے۔ باقی سب حضرات بھی خاموش رہے۔ دوسرے اور تیسرے شاعر کے ساتھ بھی ایسا ہی ہوا۔ چوتھے شاعر نے جو یہ صورت دیکھی تو بہ آواز بلند فرمایا ''صاحبو! میں مشاعرہ میں شعر سنا رہا ہوں یا قبرستان میں؟'' اس پر خوب ہنسی ہوئی۔ وزیر صاحب نے پوچھا کہ بات کیا ہے؟ انہیں

کیفیت بتائی گئی تو انہوں نے فرمایا کہ داد کے بغیر مشاعرہ کیسا! اب ڈی ایم صاحب نے مجھے کہا کہ بھئی معافی دیجئے اور یونیورسٹی کے طلباء سے کہیے کہ شعرا کو داد دینا شروع کر دیں۔ میں نے اشارہ سے چند طلباء کو ڈیس کی طرف بلایا اور کہا کہ شعرا کو داد تو نہیں ملی لیکن سب آپ کے ڈسپلن کے قائل ہو گئے ہیں۔ اب آپ شعرا کی ہمت افزائی کریں۔

پھر کیا تھا مشاعرہ میں داد کا وہ ہنگامہ ہوا کہ مشاعرہ اپنی رونق پر آ گیا۔ عرض کہ تقسیم کے بعد ہندو افسران کے ساتھ کچھ نہ کچھ بدمزگی چلتی رہتی تھی۔

وہ اپنی خو نہ چھوڑیں گے ہم اپنی وضع کیوں بدلیں
سبک سر ہو کے کیا پوچھیں کہ ہم سے سرگراں کیوں ہو

............☆☆☆............

پریذیڈنٹ رائیڈنگ کلب

۱۹۴۸ء میں مجھے رائیڈنگ کلب کا پریذیڈنت مقرر کیا گیا۔ رائیڈنگ کلب کی ایک الگ عمارت ہے۔ جس میں چوبیس گھوڑوں کے اصطبل کے علاوہ رائیڈنگ انسٹرکٹر کا رہائشی مکان سائیسوں کے کوارٹرز اور کلب کا آفس وغیرہ ہے۔ اس عمارت سے کچھ فاصلے پر ایک وسیع میدان ہے جو رائیدنگ سکول کے نام سے مشہور ہے اور وہاں طلباء کو رائیڈنگ سکھلائی جاتی ہے۔ طلباء میں سے اچھے سواروں کا ایک سکواڈ ہوتا ہے جو اپنی شاندار یونیفارم میں یونیورسٹی کے خاص مہمانوں کو اسٹیشن سے یونیورسٹی لایا کرتے ہیں۔ رائیڈنگ اسکواڈ کے گروپ اور رائیڈنگ کپتانوں کے نام کے بورڈ آفس میں لگے ہوئے ہیں۔ میں نے دیکھا کہ ایک سال کے کپٹن کا نام بورڈ پر نہیں تھا اور باوجود کوشش کے اس نام کا پتہ نہ چل سکا۔ مجھے خیال ہوا کہ اس سال سے پہلے کپٹن کو اپنے جانشین کا پتہ ہونا لازمی ہے۔ اس سے پہلے سال کے کپتان کا نام محمد داؤد لکھا ہوا تھا لیکن ان کا موجودہ پتہ معلوم نہ تھا۔ میں نے ہوسٹل کے ریکارڈ سے ان کے طالبعلمی کے زمانہ کا گھر کا پتہ معلوم کیا اور اس پتہ پر انہیں خط لکھا کہ ان کے جانشین کپٹن کا نام بورڈ پر نہیں ہے۔ اس سے مطلع کریں تاکہ بورڈ پر لکھوا دیا جائے۔ اس کے تین چار مہینے بعد میرے نام ایک خط آیا۔ جس کے لفافے پر ''چیئرمین ریلوے

سروس کمیشن'' چھپا ہوا تھا۔ میں نے جو خط پڑھا تو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ایک طالبعلم اپنے استاد کو خط لکھ رہا ہے۔ اس میں لکھا تھا کہ یہ خط کئی مہینوں بعد اِدھر اُدھر گھومتا ہوا ان تک پہنچا۔ اس خط سے ان کو اپنی طالبعلمی کا زمانہ یاد آ گیا اور اگر میرا لاہور آنا ہو تو میں ان کو ضرور مطلع کروں۔ اور یہ کہ جس کپٹن کا نام دریافت کیا ہے وہ یہ خود ہی تھے کیونکہ وہ دو سال رائیڈنگ کپتان رہے تھے۔ اس خط سے مجھے بہت خوشی ہوئی۔ ایک تو اس وجہ سے کہ بورڈ میں خالی جگہ پُر ہوگئی اور دوسرے اس لئے کہ ایک علیگ کو یونیورسٹی اور اس کے اساتذہ کا کس قدر احترام ہوتا ہے۔ موسم گرما کی تعطیل میں ہر سال میں اپنے دونوں لڑکوں اور عزیزوں سے ملنے پاکستان آیا کرتا تھا۔ جب میں لاہور پہنچا تو میں نے داؤد صاحب کو مطلع کیا۔ دوسرے دن وہ مجھے ملنے آئے۔ اور فرمایا کہ میں ان کے ساتھ کھانا کھاؤں وہ چند اور علیگرز کو بھی مدعو کریں گے۔ ان کے یہاں علیگرز سے مل کر بہت خوشی ہوئی اور خوب پر تکلف کھانا کھایا۔ اس کے بعد انہوں نے اپنے زمانہ طلاب علمی کے رائیڈنگ گروپ دکھائے جس میں اس سال کا گروپ بھی تھا۔ اور وہ اس میں بحثیت کپتان موجود تھے۔ میں نے مذاق میں کہا کہ اس ثبوت کی کیا ضرورت تھی میں نے تو آپ کے خط کو کافی سمجھا تھا۔ اس پر خوب ہنسی رہی۔ جب میں علیگڑھ سے مستقل پاکستان آ گیا تو معلوم ہوا کہ داؤد صاحب پشاور ہائیکورٹ کے جج مقرر ہو گئے تھے اور ریٹائرمنٹ پر ایبٹ آباد میں سکونت اختیار کر لی ہے۔ جولائی ۱۹۷۲ء میں کراچی سے ریٹائر ہو کر جب میں ایبٹ آباد آ گیا تو معلوم ہوا کہ ایک سال کا عرصہ ہوا کہ وہ اللہ کو پیارے ہو گئے۔ مجھے اس خبر سے بہت رنج ہوا۔ مگر ہو کیا سکتا تھا۔ كُلُّ نَفْسٍ ذَائِقَةُ الْمَوت۔ ۱۹۵۷ء میں میری پریذیڈنٹ رائیڈنگ کلب کی میعاد ختم ہوگئی اور میں اس عہدے سے سبکدوش ہو گیا۔

☆☆☆

ٹریژرراسٹوڈنٹس یونین

۱۹۴۸ء میں مجھے اسٹوڈنٹس یونین کی کیبنٹ نے اپنا ٹریژرر منتخب کیا اور وجہ یہ بتائی کہ یونین فنڈ میں ڈونیشن وغیرہ کی کافی رقم عرصہ سے جمع ہے اور انہیں امید ہے کہ میں بجائے جمع رکھنے کے اس روپیہ کو ان کی خواہش کے مطابق یونین کی عمارت وغیرہ پر خرچ کردوں گا۔ میں نے وائس چانسلر صاحب سے مشورہ کیا تو انہوں نے فرمایا کہ یونین کا روپیہ طلباء کی خواہش کے مطابق خرچ کر دینا چاہیے۔ یونین کا ہال اور اوپر کی منزل پر لائبریری "ریڈنگ روم" اور کمیٹی روم تو اچھی حالت میں تھے مگر گراؤنڈ فلور پر کمرے اچھی حالت میں نہ تھے۔ اس عمارت کے قریب یونین کی مسجد اور یونین کا پرائمری سکول (جس میں غریب ملازمین کے بچوں کو مفت پڑھایا جاتا تھا) نامکمل حالت میں تھے۔ طے پایا کہ یونین کا روپیہ ان کاموں پر خرچ کیا جائے۔ چنانچہ یونین کی مسجد اور یونین اسکول کی عمارت مکمل کرائی گئی اور گراؤنڈ فلور پر موجودہ بوسیدہ کمروں کی جگہ یونین کا دفتر، لاؤنج اور کامن روم تعمیر کرائے گئے۔ اس کے علاوہ یونین کے وسیع لان میں فوارہ لگایا گیا۔ یہ فوارہ سرسید نے سوسائٹی گارڈن میں لگوایا تھا مگر پانی کی کمی کی وجہ سے نہ چل سکا۔ صاحبزادہ آفتاب احمد خان صاحب نے اس فوارے کو سوسائٹی گارڈن سے اٹھا کر سوئمنگ باتھ لان میں لگوادیا مگر وہاں بھی پانی

کا پریشر کم ہونے کی وجہ سے نہ چل سکا۔ کچھ عرصہ بعد جب سوئمنگ لان پر مزید ٹینس کورٹ بنوائے گئے تو یہ فوارہ وہاں سے بھی ہٹا دیا گیا۔ اور بیکار پڑا تھا۔ مجھے خیال ہوا کہ اسے یونین کے لان میں لگا دینا چاہیے۔ علیگڑھ میں واٹر ورکس کی وجہ سے یونیورسٹی میں بھی پائپ لائن آگئی تھی اس لئے خیال ہوا کہ اب یہ فوراہ خوب چل سکے گا۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ اور یونین کے لان میں یہ بہت اچھا اضافہ ہو گیا۔ اس سلسلہ میں دلچسپ بات یہ ہے کہ جس مستری سے سرسید نے سوسائٹی گارڈن میں یہ فوارہ لگوایا تھا اس کے فرزند نے اب اس کو یونین لان میں لگایا۔

ڈپٹی حبیب اللہ خان صاحب جو یونیورسٹی سے بہت محبت رکھتے تھے انھوں نے فرمایا کہ ان کی بڑی خواہش ہے کہ وہ اس فوارہ میں پانی چلتا ہوا دیکھیں۔ چنانچہ وہ میرے ہمراہ یونین تشریف لائے اور یونین کی ہر چیز دیکھی۔ اور دیر تک اس فوارہ کو دیکھتے رہے اور فرمایا کہ ستر پچھتر سال بعد اس فوارہ میں ایسا پانی چلا ہے۔ یونین کے نام اپنے پیغام میں ڈپٹی صاحب نے حسب ذیل تاثرات کا اظہار کیا۔

''میرے زمانے کا اسٹوڈنٹس یونین کلب آپ کے یونیورسٹی یونین سے ہر پہلو سے مختلف تھا عمارت میں اس کو تو موجودہ شاندار عمارت سے کوئی نسبت ہی نہ تھی۔ اس پرانی عمارت کے شمالی حصہ کی شکل بھی آپ نے اب بدل دی ہے۔ لیکن یہ تبدیلی بہتری کی ہے میرے زمانے میں یونین میں اندرون خانہ کی قسم کے کھیل بالکل نہ تھے۔ اب جو مکرمی شیخ محمد شفیع ساحب آنریری ٹریژرر یونین مجھ کو چھ ہفتے ہوئے آپ کی یونین میں لے گئے تو میں عمارت اور اس کی ہر چیز دیکھ کر دنگ رہ گیا۔ اب یونین میں ہر چیز اس قدر اعلیٰ پیمانے پر ہے کہ ہمارے زمانہ میں تو اس کا خیال بھی نہیں کیا جا سکتا تھا۔''

میں نے چاہا کہ اب میں یونین کی ٹریژرر سے سبکدوش ہو جاؤں مگر طلباء نے بڑی محبت سے مجھے مجبور کیا میں ریٹائرمنٹ تک ٹریژرر رہوں اور ایسا ہی ہوا۔

اس میں شبہ نہیں کہ تقسیم کے بعد یونیورسٹی میں عمارات اور باغات وغیرہ میں کافی ترقی اور اضافہ ہوا۔ اور بظاہر اس کی حالت رو بہ ترقی تھی۔ مگر وقت گزرنے کے ساتھ اس کی روایات ختم ہونے لگیں۔ اس کی کئی وجوہ ہو سکتی ہیں۔ حکومت کی پالیسی، وائس چانسلر صاحبان کی مجبوری، حکومت کو خوش کرنے کی کوشش ان سب باتوں کی نمایاں صورت کی چند مثالیں حسب ذیل ہیں۔

(ا) صدر یا وزراء کے یونیورسٹی آنے پر سب کیلئے ہندوانہ کھانا پکنا شروع ہو گیا اور وہ میز پر تھالوں میں رکھا جانے لگا۔ ایک ایسے ہی موقع پر یونیورسٹی کے ایک ہندو انگلستان میں پڑھے ہوئے استاد جو وائس چانسلر صاحب کی طالب علمی کے زمانے میں اسٹاف پر تھے ان سے مخاطب ہو کر بولے

''ذاکر حسین! یہ کیا گھاس پھونس پکوایا ہے؟''

(ب) ایک دفعہ سالانہ کانوکیشن کے موقع پر یونیورسٹی نے یوپی کے وزیراعلیٰ کو اعزازی ڈگری دینے کا فیصلہ کیا۔ اس سلسلہ میں جب وہ تشریف لائے تو ڈریسنگ روم میں ان کو ڈگری کا گون اور اس کا جز ترکی ٹوپی پیش کی گئی۔ تو انہوں نے گون تو لے لیا مگر ترکی ٹوپی نہیں پہنی۔ خیال ہوا کہ شاید ننگے سر رہیں گے مگر تھوڑی دیر بعد انہوں نے گاندھی کیپ پہن لی۔ ڈگری کے گون اور گاندھی کیپ کا عجب بے تکا ساتھ تھا۔ مگر انہوں نے اسے ٹھیک سمجھا۔ اس سے پیشتر جب انگریز گورنر اور وائسرائے وغیرہ کی اعزازی ڈگریاں دی گئیں تو وہ ڈگری کا گون اور ترکی ٹوپی بڑی خوشی سے پہنتے تھے۔ اور ان میں تصویر کھنچواتے تھے۔

(ج) جناب بشیر حسین صاحب زیدی کی وائس چانسلری میں ہندو تہوار منانے کا

سلسلہ شروع ہو گیا۔ مثلاً ہولی کھیلنا اور دیوالی منانا۔ اور رفتہ رفتہ لڑکے یونیفارم پہننا بھی چھوڑنے لگے۔

بہر حال میری پراکٹری کی میعاد ۱۹۵۶ء میں ختم ہو گئی اور میں اس عہدے سے سبکدوش ہو گیا۔ میری جگہ ایک ہندو استاد پراکٹر بنائے گئے۔

جون ۱۹۵۸ء میں اپنی ملازمت کی مدت ختم ہونے پر میں یونیورسٹی سے ریٹائر ہو گیا۔ خیال ہوا کہ اتنی طویل ملازمت کے بعد کچھ آرام کیا جائے۔ اس لئے چار پانچ مہینے کیلئے نینی تال چلے گئے۔ اس کے بعد سوچا کہ پاکستان جانے سے قبل پرانے دوستوں سے ملنا چاہیے۔ اس سلسلہ میں متعدد شہروں میں چند دنوں کیلئے دوستوں کے پاس قیام کیا۔ پھر دہلی اور آگرہ کی سیر کی۔ اور ۱۹۵۹ء کے شروع میں علی گڑھ واپس آئے۔ وائس چانسلر (جناب بشیر حسین صاحب زیدی) نے مجھے کھانے پر مدعو کیا اور کھانے کے بعد انہوں نے فرمایا کہ میں پاکستان جانے کا خیال چھوڑ دوں۔ میں انکار کرتا رہا اور وہ اصرار کرتے رہے۔ انہوں نے کہا کہ آپ کو تو علی گڑھ سے بہت محبت ہے۔ آخر کیوں جانا چاہتے ہیں۔ یونیورسٹی میں آپ کو کوئی نہ کوئی کام ملتا ہی رہے گا۔ میں نے کہا کہ اس کی وجہ سن کر آپ خوش نہیں ہوں گے۔ انہوں نے فرمایا کہ وجہ بتلایئے میں نے کہا کہا ''یہ وہ علیگڑھ نہیں رہا جس کی میں خدمت کرنا چاہتا تھا'' اس پر وہ خاموش ہو گئے۔

علی گڑھ میں میرے کرم فرما عبید الرحمٰن خان صاحب شیروانی نے زور دیا کہ ہم ان کے یہاں بھی چند دن گزاریں۔ اور وہ ہم کو حبیب منزل لے گئے۔ اور تقریباً دو مہینے روکے رکھا ان کی پرخلوص محبت اور مہمانداری ہمیشہ یاد رہے گی۔ اس کے بعد ہم پاکستان آ گئے۔

جامعہ ملیہ کالج کراچی کی ملازمت

(۱۹۵۹ء تا ۱۹۷۲ء)

۱۹۵۹ء میں علیگڑھ سے ریٹائرمنٹ کے بعد جب پاکستان آئے تو ہم دونوں کی نیشنیلٹی کا سوال پیدا ہوا۔ اس کے متعلق لاہور میں جہاں ہم ٹھہرے ہوئے تھے درخواست داخل کر دی گئی۔ معلوم ہوا کہ اس پر کراچی میں وزارت داخلہ سے احکامات صادر ہوں گے۔ اسی عرصہ میں جامعہ ملیہ کالج سے ملازمت کے سلسلہ میں خط ملا۔ میں نے سوچا کہ کراچی جا کر اس کے متعلق گفتگو کروں اور نیز نیشنلٹی کے بارے میں بھی دریافت کروں۔ غالباً شروع جون میں کراچی پہنچ کر جامعہ کے افسران سے ملاقات ہوئی۔ اور پھر میں نے جامعہ کو بھی دیکھا۔ طے پایا کہ جولائی میں نئے تعلیمی سیشن سے تین سال کی مدت کیلئے کالج پرنسپل کا عہدہ سنبھال لوں۔ اس دوران ہماری نیشنلٹی کی درخواست بھی منظور ہو گئی مجھے بہت خوشی ہوئی کہ نیشنلٹی اور ملازمت میں کسی قسم کی دشواری نہیں ہوئی۔ کہاں یہ خیال کہ بارہ سال بعد پاکستان جانے پر نہ نیشنلٹی ملے گی اور نہ کوئی ملازمت اور کہاں ان کے ملنے میں اس

قدر آسانی۔

فکرِ ما در کارِ ما آزارِ ما
کار سازِ مابہ فکرِ کارِ ما

غرض جولائی ۱۹۵۹ء میں کراچی پہنچ کر جامعہ ملیہ کالج میں پرنسپل کے عہدے کا چارج لے لیا۔ اس سے پہلے میں نے کسی نجی ادارہ میں کام نہیں کیا تھا اور میرے لئے یہ ایک نیا تجربہ تھا۔ اس وقت یہ کالج انٹرمیڈیٹ تک تھا اور اس میں آرٹس، سائنس اور کامرس کی پڑھائی ہوتی تھی۔ کالج اور ہوسٹل کی عمارت نامکمل تھی۔ عجیب بات یہ تھی کہ ہوسٹل بالکل کالج سے ملحق تھا۔ طلباء کی رہائش گاہ ہونے کی وجہ سے ہوسٹل کا کچھ اپنا ماحول ہوتا ہے۔ اس لئے اسے کالج سے فاصلہ پر ہونا چاہیے۔ آگے چل کر اس قربت نے دشواری پیدا کر دی۔ مثلاً یہ کہ جب کالج کا اسمبلی ہال ڈائننگ ہال کی چھت پر بنا تو کالج اور ہوسٹل کا معاملہ عجب گڈمڈ ہو گیا۔ اس کے علاوہ جب ہوسٹل میں طلباء کی تعداد بڑھی تو اس کا شوروغل کالج کی کلاسوں پر اثر انداز ہونے لگا۔ جس کی اساتذہ شکایت کرتے تھے۔ مگر ہو کیا سکتا تھا۔

خشتِ اول چوں نہد معمار کج
تا ثریا می رود دیوار کج

کالج میں بھی کلاس روم ایک دوسرے سے ملے ہوئے تھے۔ نیز سائنس لیبز کی تعمیر کسی قاعدہ کے تحت نہ تھی۔ بظاہر ایسا معلوم ہوتا تھا کہ جامعہ میں کالج کا کوئی خاص تصور نہ تھا۔ کچھ عرصہ بعد جب کالج نے ترقی کی اور یہ ڈگری کالج بنا اور طلبا کی تعداد میں اضافہ ہوا تو نئے سے نئے مسائل رونما ہوئے۔ کالج کے علاوہ اس وقت ایک ہی کیمپس میں دو اور ادارے قائم ہو چکے تھے۔ ایک پرائمری اسکول ذرا کالج سے فاصلہ پر اور دوسرا بوائز

سکینڈری اسکول کالج کے بالکل قریب تھا۔ اس کے علاوہ چھوٹے چھوٹے رہائشی کوارٹروں کی قطار اوران کی یکسانیت اوران میں ہرادارے اور ہر درجہ کے ملازمین کا رہنا ایک انوکھی سی بات تھی۔ آگے چل کران کوارٹروں کی پشت پران سے بالکل ملی ہوئی کوارٹروں کی ایک اور قطار تعمیر ہوئی تو اور زیادہ رونق پیدا ہوگئی۔ آئندہ چند سالوں میں اسی کیمپس میں چار اور ادارے قائم ہوئے۔ یعنی انسٹی ٹیوٹ آف ایجوکیشن، انسٹی ٹیوٹ آف ٹیکنالوجی، گرلز سکینڈری اسکول اور بی ٹی کالج برائے طالبات۔ ان سب کی وجہ سے کیمپس میں وہ کشادگی باقی نہ رہی جو ہونی چاہیے تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ جامعہ کے متعلق کوئی ہمہ گیر منصوبہ نہ تھا سوائے اس کے کہ اداروں میں اضافہ ہوتا رہے خواہ ان کے چلانے کیلئے روپیہ ہو یا نہ ہو اور خواہ وہ مالی دشواریوں سے دوچار رہیں۔

دریا کو اپنی موج کی طغیانیوں سے کام
کشتی کسی کی پار ہو یا درمیاں رہے

اس میں شبہ نہیں کہ جامعہ کیمپس ملیر نہایت اچھی جگہ واقع ہے جو تعلیم کے لحاظ سے نہایت موزوں ہے۔ کراچی کے کسی اور ادارے کو ایسا ماحول میسر نہیں۔ اگر یہاں کسی منصوبہ کے تحت کوئی ایک اقامتی ادارہ قائم کیا جاتا تو وہ کتنا مثالی ادارہ ہوسکتا تھا خواہ وہ اسکول ہوتا یا کالج۔

بہرحال مجھے تو کالج سے سروکار تھا۔ جب میں یہاں پہنچا تو معلوم ہوا کہ جامعہ میں مرکزیت کا دور دورہ ہے یعنی کالج اور اسکولوں کے کھیلوں کا انتظام مرکزی، کالج کی لائبریری مرکزی، کالج اور اسکولوں کے طلباء کے کھانا پکنے کا انتظام مرکزی۔ میں سوچتا تھا کہ ایسی حالت میں اداروں کی انفرادیت کیسے حاصل ہوگی؟ خدا کا شکر ہے کہ رفتہ رفتہ یہ مرکزیت

کالج کی حد تک تو ختم ہو گی۔ لیکن ان سب سے بڑھ کر روپیہ کا مسئلہ تعلیمی اداروں کے بجٹ پاس ہونے کے بعد بھی کونسے اخراجات کیئے جائیں گے اور کونسے نہیں کیے جائیں گے۔ مرکزیت کا معاملہ تھا۔ کیونکہ روپیہ کی کمی تھی اور اداروں کے اضافہ کے ساتھ ساتھ یہ مسئلہ دشوار سے دشوار ہوتا چلا گیا۔

۱۹۶۰ء میں حکومت نے میاں افضل حسین صاحب کو کالجوں کے معائنہ کیلئے مقرر کیا۔ اس سلسلہ میں وہ جامعہ کالج بھی تشریف لائے انہوں نے اپنی رپورٹ میں اس کالج کے متعلق بڑے پتے کی بات لکھی:

"So long as it does not get over-crowded & students are admitted after a proper selection the Institution has a bright future."

اس وقت کالج میں طلباء کی تعداد پانچ سو کے لگ بھگ تھی۔ اور دراصل یہی تعداد یا اس سے کسی قدر زیادہ ہر لحاظ سے نہایت مناسب تھی۔ کیونکہ جب تک اساتذہ اور طلباء میں قریبی رابطہ ہونے کا امکان نہ ہو ڈسپلن قائم رکھنا دوشوار ہو جاتا ہے اور طلباء کی بڑھتی ہوئی تعداد میں یہ ناممکن ہو جاتا ہے۔ بہر حال جامعہ نے روپیہ کی کمی کا علاج طلباء کی تعداد میں اضافہ سمجھا۔ اور سال بہ سال کالج میں طلباء کی تعداد بڑھتی چلی گئی۔ اور ۱۹۶۴ء میں ایک ہزار تک پہنچ گئی۔ کالج کی سائنس لیبز کلاس رومز اور دوسری سہولتوں کے پیش نظر یہ تعداد بھی زیادہ تھی۔ مگر اس سے زیادہ کا تو کوئی سوال ہی نہ تھا۔ بہر حال ان حالات کے تحت میری یہی کوشش رہی کہ کالج میں بہتر سے بہتر تعلیم کے ساتھ ساتھ قاعدہ قانون کی پابندی ہو اور طلباء میں ڈسپلن قائم رہے اور غیر نصابی سرگرمیوں میں اضافہ ہوتا رہے۔ ان سرگرمیوں میں سب سے اہم مقام اسٹوڈنٹس یونین کو حاصل ہوا۔ طلباء کی خواہش اور ضرورت کے لحاظ

سے ہر فیکلٹی کی یعنی آرٹس، سائنس اور کامرس کی الگ الگ یونین قائم ہوئی۔ اس کے علاوہ کالج میگزین ہر سال باقاعدگی سے نکلتی رہی۔ مضامین کے لحاظ سے سوسائٹیاں بنائی گئیں۔ کھیلوں کے سلسلہ میں ہاکی، فٹ بال، والی بال، باسکٹ بال وغیرہ کا انتظام ہوا۔ اور طلباء اور طالبات کیلئے علیحدہ علیحدہ کامن روم قائم ہوئے جن میں ان ڈور گیمس خاص طور سے ٹیبل ٹینس سب سے زیادہ مقبول ہوا۔ غرض کہ رفتہ رفتہ کالج نے خوب ترقی حاصل کی اور اس نے کراچی کے اداروں میں اپنا ایک خاص مقام پیدا کیا۔ ۱۹۶۵ء میں جناب ڈاکٹر اشتیاق حسین صاحب قریشی وائس چانسلر کراچی یونیورسٹی نے کالج کے متعلق حسب ذیل خیالات کا اظہار کیا۔

"When there are so many institutions which are run blatantly on commercial lines & which have no respect for academic decencies, institutions like the Jamia stand like isolated beacons of light in the midst of an oceon of gloom and darkness."

۱۹۶۶ء میں عبیدالرحمٰن کمیشن رپورٹ میں جامعہ کالج کو حسب ذیل الفاظ میں سراہا گیا:

"In Karachi we visited at least one private college which needs special mention. We refer to the Jamia College at Malir, we feel that only institutions of this benefecient character can justify the existence of a private secton in education."

۱۹۷۰ء تک اسی قسم کے حالات رہے اور طلباء کی تعداد ایک ہزار تک رہی۔ اس سال میری ملازمت کی میعاد ختم ہو رہی تھی۔ اور میں نے جامعہ سے سبکدوش ہونے کی خواہش

کی۔ مگر گورننگ باڈی نے فیصلہ کیا کہ دو سال اور ٹھہروں اور ساتھ ہی ساتھ وائس پرنسپل کا بھی تقرر کیا کہ دو سال بعد جب میں ریٹائر ہوں تو انہیں میری جگہ پرنسپل مقرر کیا جائے۔

۷۱-۱۹۷۰ء میں بڑھتی ہوئی مالی دشواری کے سلسلہ میں جامعہ نے ایک اکانومی کمیٹی مقرر کی کہ وہ اداروں کی مالی دشواری پر قابو پانے کیلئے اخراجات میں کمی اور آمدنی میں اضافہ کے متعلق اپنی تجاویز پیش کرے۔ اخراجات میں کمی کی تو کوئی گنجائش نہ تھی کیونکہ وہ پہلے ہی کم سے کم تھے البتہ آمدنی میں اضافہ کیلئے ایک ہی مجرب نسخہ تھا یعنی طلباء کی تعداد میں اضافہ کیا جائے۔ سال ۷۲-۱۹۷۱ء کے داخلوں کے وقت میں موجود نہ تھا اس سال داخلے تیرہ سو سے بھی کچھ زائد ہوئے اتنی بڑی تعداد کیلئے کالج کے وسائل بالکل ناکافی تھے۔

بہر حال میری ملازمت کی میعاد ۳۰ جون ۱۹۷۲ء تک تھی اور میں ایک ہفتہ پہلے ہی سبکدوش ہو گیا۔ تا کہ اس کے بعد ایک ہفتہ تک یہاں رکا رہوں۔ اور ۳۰ جون ۱۹۷۲ء کو ہم دونوں کراچی سے روانہ ہو کر ۲ جولائی ۱۹۷۲ء کو ایبٹ آباد پہنچ گئے اور ریٹائرمنٹ کی پرسکون زندگی گزارنے لگے۔

ستمبر ۱۹۷۲ء میں حکومت نے جامعہ ملیہ کالج کو اپنی تحویل میں لے لیا۔ مجھے اس بات سے بہت خوشی ہوئی اور یقین ہے کہ جامعہ کے افسران کو بھی اطمینان ہوا ہوگا۔ اس لئے کہ اب کالج کو مالی دشواری سے نجات ملے گی۔ اور اس کی آئندہ ترقی میں کوئی رکاوٹ نہیں ہوگی۔ میں نے جامعہ ملیہ کالج میں تیرہ سال خدمت کی اور مجھے اس کالج سے بہت لگاؤ ہے اور میری دلی تمنا ہے کہ وہ خوب پھولے پھلے۔

اگر اب میں وہاں ہوتا تو حکومت سے درخواست کرتا کہ سب سے پہلے کالج اور ہوسٹل کا معاملہ طے کرے۔ پچاس ساٹھ اقامتی طلباء کی کوئی خاص حیثیت نہیں اس لیے

ہوسٹل کو ختم کر دینا چاہیے۔ اور اس میں سائنس لیبز کی توسیع کرنا چاہیے اور کلاس رومز کی کمی کو پورا کرنا چاہیے۔ اس کے علاوہ کالج کے وسائل کو مدنظر رکھتے ہوئے طلباء کی تعداد متعین کرنا چاہیے۔ تاکہ محض آمدنی میں اضافہ کی غرض سے داخلوں کا سلسلہ ختم ہو سکے۔ کالج ٹیچنگ اسٹاف کیلئے فلیٹ اور موزوں مکان بنائے جائیں تاکہ وہ اپنی پوزیشن کے مطابق معقول زندگی گزار سکیں۔ جامعہ میں چپراسی اور لیب بوائز کیلئے رہائش کا کوئی انتظام نہ تھا۔ میں نے کالج میں ایسے ملازمین کیلئے کچھ انتظام کیا تھا مگر وہ کافی نہ تھا۔ ایسے اسٹاف کیلئے کالج کے قریب مناسب جگہ پر کوارٹر بنانے چاہئیں۔ یہ سب تو اپنے تجربے کی بنا پر میرا خیال ہے۔ مگر موجودہ کارکن اس بارے میں زیادہ سوچ سکتے ہیں اور جیسا مناسب سمجھیں کریں۔

جامعہ کالج کی ملازمت کے زمانے میں پانچ سال تک میں کراچی یونیورسٹی کی سنڈیکیٹ کا ممبر رہا۔ اور اس کے بعد چھ سال تک کراچی انٹرمیڈیٹ بورڈ کا ممبر رہا۔ مجھے سب سے زیادہ قدر اس بات کی ہے کہ میرے ساتھی کالج پرنسپل صاحبان نے مجھے کالج پرنسپلز ایسوسی ایشن کا صدر منتخب کیا۔ جس کی مدت تین سال تک رہی۔ بہرحال اپنی بساط کے مطابق جو کچھ بھی خدمت میں علیگڑھ اور کراچی میں کر سکا وہ میرے لئے خوشی اور اطمینان کا باعث ہے۔

میری زندگی کی یہ مختصر داستان نامکمل رہے گی۔ اگر میں اپنی رفیقہ حیات کا شکریہ ادا نہ کروں کہ جن کی سلیقہ مندی، کردار کی بلندی اور توجہ کی بدولت بہ فضل خدا میں ایک پرسکون اور خوشگوار زندگی سے ہمکنار ہوں۔

☆☆☆

علیگیات

کچھ علیگیات کے بارے میں

میں نے اپنے منجھلے بھائی (ایس ایم یامین صاحب) کے اصرار پر ''علیگیات'' کا یہ سلسلہ سپردِ قلم کیا۔ امید ہے کہ یہ علیگڑھ کی دلچسپی کا باعث ہوگا۔ اس میں کسی کا نام نہیں لکھا سوائے اس کے کہ جہاں کوئی چارہ نہ تھا۔ یہ واقعات کچھ تو میری طالب علمی کے زمانہ کے ہیں اور کچھ اس زمانہ کے ہیں جب میں اسٹاف پر تھا۔ دو ایک اس کے علاوہ بھی ہیں۔ علیگیات کے مفہوم کو علیگز تو خوب سمجھتے ہیں۔ ان کے علاوہ حضرات کیلئے یہ بتانا ضروری ہے کہ علیگڑھ کے ہمہ گیر اقامتی نظام نے جو ماحول پیدا کیا اس نے وہاں کے ہنسی، مذاق اور لطائف کو ایک ایسا معیار بخشا جو تہذیب، ذہانت اور اخلاق سے بھرپور ہے۔

ایس۔ایم۔شفیع

علیگیاتی لطائف

(۱)

ایک دفعہ فارسی کے مولوی صاحب نے کلاس میں فرمایا کہ کل سے ''دیوانِ حافظ'' شروع ہوگا۔ ایک لڑکے کو جو شرارت سوجھی تو اس نے تعجب کے لہجے میں پوچھا، جناب: ''یہ تو اچھے خاصے تھے دیوانے کب سے ہو گئے''، مولوی صاحب نے غصہ میں زور سے کہا ''دیوانِ حافظ'' اس لڑکے نے نہایت ادب سے عرض کیا۔ جناب: ''یہ ہی تو میں گذارش کرتا ہوں۔ یہ دیوانے کب سے ہو گئے''۔ اس پر تمام کلاس ہنس پڑی اور مولوی صاحب بہت ناراض ہوئے۔

(۲)

علیگڑھ میں محرم کی دس چھٹیاں ہوا کرتی تھیں۔ بعد میں کالج کو خیال ہوا کہ کم ہونی چاہئیں۔ یعنی پانچ یا چھ، لڑکوں نے دینیات کی کلاس میں یہ بات اٹھائی تو مولوی صاحب نے فرمایا کہ سرسید، محسن الملک اور وقارالملک کا زمانہ تو کچھ اور تھا آج کل کے افسران تو شش و پنج میں پڑے ہوئے ہیں۔

(۳)

ایک موقع پر لڑکے دینیات کی کلاس کا کچھ وقت تبدیل کرانا چاہتے تھے انہوں نے

کلاس میں مولوی صاحب سے درخواست کی کہ اس بارے میں وہ لڑکوں کی مدد کریں۔ اس زمانہ میں ٹول صاحب کالج کے پرنسپل تھے۔ مولوی صاحب نے فرمایا ''اچھا بھئی میں ٹول صاحب کو ٹٹولوں گا مگر خیال ہے کہ وہ ٹال مٹول کریں گے''!

(۴)

ایک مرتبہ ایک لڑکے کے گھر سے آم آئے۔ وہ لڑکا بیک روم میں رہتا تھا اور وہیں یہ آم چارپائی کے نیچے رکھے ہوئے تھے۔ ان دنوں میں جب کوئی اس سے ملنے آتا تو وہ فوراً فرنٹ روم میں آجاتا تھا اور وہیں سے آنے والے کو رخصت کر دیتا تھا۔ یار لوگوں کو شبہ ہوا کہ کوئی معاملہ ضرور ہے۔ معلوم ہوا کہ بیک روم میں آموں کا مسئلہ ہے۔ اب کیا تھا کچھ لڑکے اس سے ملنے گئے اور وہ فوراً فرنٹ روم میں آگیا۔ اس کی نگاہ بچا کر ایک لڑکا بیک روم میں پہنچ گیا۔ جس کی کھڑکی کے باہر کچھ لڑکے پہلے ہی سے تعینات تھے۔ بیک روم پہنچتے ہی لڑکے نے نہایت صفائی سے آم کھڑکی کے باہر پہنچانے شروع کئے۔ اور تمام آم پہنچا کر فرنٹ روم میں آگیا۔ اور سب مل کر وہاں سے چلے آئے اور آموں کو ٹھکانے لگایا۔ بیک روم والے صاحب حیرت میں تھے کہ یہ آم کب اور کیسے انہیں داغِ مفارقت دے گئے۔

(۵)

ایک مرتبہ ایک لڑکے کے والد ماجد کو دہلی جاتے ہوئے علیگڑھ سے گزرنا تھا۔ انہوں نے اپنے لڑکے کو پوسٹ کارڈ سے اطلاع دی کہ وہ اس کیلئے ناشتہ لائیں گے جسے وہ علیگڑھ ریلوے اسٹیشن پہنچ کر وصول کر لے۔ علیگڑھ میں پوسٹ مین بورڈنگ کی ڈاک نیچے پھیلا دیتا تھا کہ لڑکے اپنے اپنے خط اٹھالیں۔ یہ چونکہ پوسٹ کارڈ تھا اور اس میں ناشتہ کا ذکر تھا اس لئے کسی اور لڑکے نے اٹھالیا اور لکھے ہوئے دن اور وقت پر اسٹیشن پہنچ گیا۔ جب ٹرین آکر رکی تو اس نے دیکھا کہ ایک بزرگ اِدھر اُدھر دیکھ رہے ہیں وہ سمجھ گیا کہ یہ وہی ہیں جن

کی اسے تلاش ہے۔ اس نے انہیں آداب کیا اور معلوم ہوا کہ اس لڑکے کے والد ہیں۔ اس نے بتایا کہ ان کے صاحبزادہ کی طبیعت کچھ معمولی سی خراب ہے اس لئے اس نے مجھے بھیجا ہے اور آپ کے اطمینان کیلئے یہ پوسٹ کارڈ بھی دے دیا ہے۔ وہ بزرگ بہت خوش ہوئے۔ اور پورا ناشتہ اس کے حوالے کر دیا۔ اس لڑکے نے بورڈنگ پہنچ کر اپنے یار دوستوں کے ساتھ حلوہ پراٹھے بالائی وغیرہ پر خوب ہاتھ صاف کئے۔ ان والد بزرگوار اور ان کے فرزند کے درمیان جو گزر رہی ہوگی وہ ان کا اپنا معاملہ تھا۔

(۶)

ایک استاد کسی دیر سے آنے والے لڑکے کو اپنی کلاس میں نہیں آنے دیتے تھے۔ ایک دن جب بلیک بورڈ پر کچھ لکھ رہے تھے اور ان کی پیٹھ کلاس کی طرف تھی۔ تو ایک دیر سے آنے والا لڑکا جو اکثر غیر حاضر رہتا تھا آ کر بیٹھ گیا۔ استاد نے جب بلیک بورڈ سے کلاس کی طرف رخ کیا تو اس لڑکے کو کچھ نہیں کہا اس لئے کہ انہوں نے اسے دیر سے آتے دیکھا ہی نہ تھا۔ کلاس میں پاس بیٹھے ہوئے لڑکے نے کہا معلوم نہیں تمہیں کلاس سے باہر کیوں نہیں کیا۔ اس لڑکے نے شیخی سے جواب دیا "باہر کیا کرتے وہ اسی کو غنیمت سمجھ رہے ہیں کہ میں ان کی کلاس میں آ ہی گیا ہوں"!

(۷)

ایک دفعہ انگریزی کی کلاس میں "ایسے" لکھوایا گیا۔ پروفیسر صاحب ان کو جانچنے کیلئے اپنے ساتھ لے گئے۔ چند دن بعد انہوں نے کلاس کو بتایا کہ کس لڑکے کو کتنے نمبر ملے ہیں۔ پھر خود ہی فرمایا کہ یہ لڑکا اول کیسے آ گیا یہ تو میری کلاس میں بہت کم آتا تھا۔ اس لڑکے نے بڑے ادب سے جواب دیا۔ "That explains it, Sir" اس کی حاضر جوابی پر پروفیسر صاحب بھی ہنس پڑے اور لڑکے بھی۔

(۸)

ایک دفعہ لڑکوں نے دینیات کے مولوی صاحب سے پوچھا کہ اس کی کیا وجہ ہے کہ بعض لوگ حج کرنے کے بعد اور زیادہ بے ایمانی کرتے ہیں۔ مولوی صاحب نے فرمایا کہ وجہ تو صاف ظاہر ہے خانہ کعبہ ایمان کا گھر ہے اور جب ایسا آدمی وہاں پہنچتا ہے تو ایمان اسے چھوڑ کر اپنے گھر میں رک جاتا ہے اور جو بھی تھوڑا بہت ایمان اس کے پاس تھا وہ بھی نہیں رہتا۔

(۹)

ایک دفعہ ایک پروفیسر صاحب اپنی کلاس میں پڑھا رہے تھے کہ انہیں ایک تار ملا اس کو پڑھ کر وہ کرسی پر بیٹھ گئے اور ان کے چہرے سے خوشی اور شرماہٹ کے آثار نمایاں تھے۔ کلاس کے ایک لڑکے نے ان کے قریب آ کر پوچھا کہ بات کیا ہے یہ کیسا تار آیا ہے پروفیسر صاحب نے تار اس لڑکے کے سامنے رکھ دیا اس میں لکھا تھا۔ "Blessed with son and heir congratulations" اس لڑکے نے کہا جناب! یہ کونسی گھبراہٹ کی بات ہے خدا کے فضل سے یہ آپ کا شاگرد تین بچوں کا باپ ہے اس پر کلاس ہنس پڑی اور پروفیسر صاحب سے مٹھائی کی درخواست کی۔

(۱۰)

یونیورسٹی کے اکثر لڑکے شام کے وقت ریلوے اسٹیشن کا چکر لگاتے ہیں اور میل ٹرین کو رخصت کر کے واپس آ جاتے ہیں۔ ایک ایسے ہی موقع پر ایک لڑکے نے ڈائننگ کار سے ''بروسٹ چکن'' کی آواز سنی تو کان کھڑے کئے تھوڑی دیر میں بیرے نے روسٹ چکن کی پلیٹ میز پر رکھ دی۔ صاحب بہادر اخبار پڑھنے میں مشغول تھے۔ اس لڑکے نے اس موقع کو غنیمت جانا اور نہایت صفائی سے ہاتھ بڑھا کر پلیٹ اڑا لی اور ذرا دور ہٹ کر اندھیرے

میں اسے چٹ کرنے لگا۔ اتنے میں صاحب بہادر نے اخبار رکھ کر دیکھا کہ بیرے نے بہت دیر کر دی ہے۔ اسلئے زور سے آواز دی ''بیرہ روسٹ چکن'' بیرہ جو ادھر آیا تو اس کی حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی۔ اور یہ لڑکا دور سے صاحب بہادر اور بیرے کی تو تو میں میں اور روسٹ چکن کے مزے لیتا رہا۔ یہاں تک کہ ٹرین چلی گئی۔

(۱۱)

ایک دن ڈاکٹر سر ضیاالدین احمد صاحب کی کلاس میں آنے سے پیشتر کسی لڑکے نے بورڈ پر شعر لکھ دیا

دعویٰ بہت بڑا ہے ریاضی میں آپ کو
طولِ شبِ فراق ذرا ناپ دیجئے

ڈاکٹر صاحب جب کلاس میں داخل ہوئے تو بورڈ پر لکھے ہوئے شعر پر نگاہ پڑی انہوں نے کلاس کی حاضری لی اور پھر اُٹھ کر بورڈ پر "Ad-Infinitum" لکھ دیا۔ لڑکوں نے خوب تالیاں بجائیں۔

(۱۲)

ایم اے او کالج میں پروفیسر رنیل ایک نہایت قابلِ استاد تھے۔ ان کی فرض شناسی کا یہ عالم تھا کہ وقت سے پانچ منٹ قبل ہی کلاس میں آجاتے تھے اور بڑی محنت سے پڑھاتے تھے۔ ایک دن گھنٹہ بجنے کے کچھ دیر بعد تک وہ کلاس میں نہیں آئے۔ لڑکوں کو خیال ہوا کہ آج نہیں آئیں گے۔ اس لئے وہ کلاس سے چلے گئے۔ اس کے بعد جب پروفیسر رنیل کلاس میں آئے تو لڑکوں کو غیر حاضر پا کر واپس چلے گئے۔ دوسرے دن جب وہ کلاس میں آئے تو لڑکوں سے گزشتہ دن کی غیر حاضری کے متعلق دریافت کیا۔ لڑکوں نے عرض کیا کہ آپ ہمیشہ وقت سے کچھ پہلے ہی تشریف لاتے ہیں اور کل گھنٹہ شروع ہونے کے بعد بھی

تشریف نہیں لائے تو ہمیں خیال ہوا کہ آج شاید کوئی اور مصروفیت ہوگئی ہوگی۔اس لئے ہم سب کلاس سے چلے گئے تھے۔ پروفیسر رنیل نے فرمایا۔" مجھے افسوس ہے کہ دیر ہوگئی۔اور وہ اس لئے کہ ایک شخص ضروری کام سے اس وقت ملنے آگیا۔ خیر جو ہوگیا سو ہوگیا آئندہ میں حسب عادت وقت سے کچھ پہلے ہی آیا کروں گا۔ اور اگر مجھے دیر ہو جائے تو آپ صرف پانچ منٹ میرا انتظار کریں اور پھر میرے گھر آئیں تو آپ مجھے زندہ نہ پائیں گے۔ ان کے اپنے الفاظ کچھ اس طرح تھے:

"If i am late, you shuld wait for five minutes, & then come to my house and you will find me dead."

اللہ اکبر! کتنی بڑی بات ہے۔ وہ کیسا زمانہ تھا اور کیسے استاد تھے۔

(۱۳)

ایک دفعہ علی گڑھ کے ایک مشہور استاد امتحان لینے علی گڑھ سے باہر گئے ہوئے تھے۔ رات کو ان کے گھر چوری ہوگئی۔ میں ان دنوں یونیورسٹی پراکٹر تھا۔ان کے صاحبزادے صبح ہوتے ہی میرے پاس آئے اور چوری کے متعلق بتایا۔ میں نے کہا کہ آپ چوری شدہ سامان کی فہرست بنا لیں۔ میں پولیس کو اطلاع کر دوں گا۔ وہ شام کو مجھ سے پھر ملے اور نہایت لمبی فہرست دے گئے۔ دوسرے دن بہت سویرے وہ استاد جو باہر گئے ہوئے تھے واپس آگئے اور میرے پاس صبح ہوتے ہی آئے اور فرمایا کہ میرے یہاں کوئی خاص چوری نہیں ہوئی آپ پولیس کو اطلاع نہ کریں۔ میں نے کہا کہ تعجب کی بات ہے آپ فرماتے ہیں کہ کوئی خاص چوری نہیں ہوئی۔ اور آپ کے صاحبزادے لمبی فہرست دے گئے ہیں۔ انہوں نے کچھ سوچا اور فرمایا "شفیع صاحب! آپ تو سمجھ دار اور تجربہ کار انسان ہیں بھلا سوچئے تو سہی کہ اگر بیٹا باپ کے گھر چوری کی فہرست بنائے گا تو وہ کیا چھوٹی فہرست ہوگی

میرے یہاں کوئی ایسی چوری نہیں ہوئی آپ پولیس کو اطلاع نہ کریں۔" خیر یہ قصہ تو یوں ختم ہوا۔ چند دنوں بعد میری ان سے ملاقات ہوئی تو میں نے کہا کہ وہ چوری ہونا اور نہ ہونا کچھ عجب سی بات تھی۔ وہ خوب ہنسے اور فرمایا کہ چوری تو کافی ہوئی تھی اور وہ فہرست بھی صحیح تھی۔ مگر میں نے سوچا کہ چیزیں تو ملنے سے رہیں البتہ گھر کے ملازم روز تھانہ بلائے جائیں گے۔ ان کی مار پٹائی ہوگی گھر میں کام کا ہرج ہوگا اور یہ سلسلہ کئی دن تک جاری رہے گا لہذا صبر کرنا چاہیے۔

(۱۴)

علیگڑھ میں کھیلوں کے کلر ہولڈرز کے کوٹ کیلئے خاص کپڑا ہوتا تھا جس میں سفید سبز اور گہرے سرخ رنگ کی مختلف چوڑائی کی دھاریں ہوتی تھیں۔ یہ کپڑا انگلستان سے بن کر آتا تھا۔ پہلی عالمی جنگ کے دوران اور اس کے کئی سال بعد تک یہ کپڑا دستیاب نہ تھا۔ ہماری ہاکی ٹیم ٹورنامنٹ میں شرکت کیلئے لکھنؤ جارہی تھی۔ میری کپتانی کا یہ پہلا ٹور تھا اور میری خواہش تھی کہ اس موقع پر میرے پاس کلر کوٹ ہو۔ میرے علم میں دو ایسے کلر ہولڈر تھے جن کے پاس یہ کوٹ تھے اور اب وہ سرکاری ملازمت میں اچھے عہدوں پر فائز تھے۔ میں نے ان دونوں حضرات سے درخواست کی کہ وہ لکھنؤ تشریف لائیں، ٹیم کا کھیل دیکھیں اور کھلاڑیوں کی ہمت بڑھائیں اور نیز اپنے کلر کوٹ بھی ساتھ لائیں کہ میں اسے پہن سکوں میرا خیال تھا کہ ان دونوں میں سے ایک تو آ ہی جائے گا مگر علیگڑھ ٹیم کی کشش سے یہ دونوں حضرات تشریف لے آئے اور اپنے اپنے کلر کوٹ مجھے دے دیئے۔ ان میں سے ایک کوٹ کافی استعمال ہو چکا تھا اور کچھ پھٹا ہوا بھی تھا دوسرا کوٹ نہایت اچھی حالت میں تھا۔ جو پرانا کوٹ لائے تھے ان سے معلوم ہوا کہ درصل یہ ان کا نہیں ہے اور یہ جن کا تھا انہوں نے اسے خوب استعمال کیا اور علیگڑھ سے جاتے وقت نہایت صفائی سے اپنے پرانے

کوٹ کوان کے نئے کوٹ سے تبدیل کرلیا۔ میں نے احتیاطاً یہ بات علیگڑھ کے ہاکی کلب کے پرانے سمجھدار اور ہر دلعزیز ملازم فقیرا خان کو بتا دی تھی۔ جب ٹورنامنٹ ختم ہوگیا اور ہماری ٹیم نے کپ جیت لیا تو ہم لکھنؤ سے علیگڑھ روانگی کی تیاری کر رہے تھے۔ اس وقت ہمارے دونوں اولڈ بوائز بھی تشریف رکھتے تھے۔ انہوں نے اپنے لائے ہوئے کلر کوٹ واپس مانگے۔ میں نے فقیرا خان کو کہا کہ جن کے جو کوٹ ہیں وہ ان کو دے دو۔ فقیرا خان تو سب کچھ سمجھے ہوئے تھے۔ انہوں نے پرانا کوٹ ان صاحب کو دے دیا جو نیا کوٹ لائے تھے۔ وہ بگڑے کہ یہ میرا کوٹ نہیں ہے۔ سب نے کہا کہ یہ آپ ہی کا ہے۔ وہ سمجھ گئے کہ بھانڈا پھوٹ چکا ہے اور کہا کہ میں اسے نہیں لینا چاہتا۔ تو ایک اور کلر ہولڈر جو چھوٹے قد کے تھے بولے کہ مجھے دے دو میں اسے اپنے ناپ پر ٹھیک کرالوں گا۔ سب نے کہا ٹھیک ہے یہ ان کو دے دو۔ اب رہا نئے کوٹ کا مسئلہ وہ میرے پاس رہا اور پھر میرے منجھلے بھائی ایس ایم یامین صاحب نے لے لیا۔ اور اپنے ناپ کا کروالیا۔ اب وہ ان کے پاس ہے۔ نیا کوٹ لانے والے صاحب جب کبھی مجھے ملتے تو فرماتے "You owe me a colour coat" ایک دفعہ میں نے ان سے پوچھا کیا آپ واقعی کلر کوٹ چاہتے ہیں تو فرمایا کہ اب کلر کوٹ پہننے کا کون سا زمانہ ہے ہم تو ہنسی مذاق کرتے ہیں۔ واقعی علیگڑھ کے ساتھی کتنے شفیق اور محبت کے انسان ہوتے ہیں۔

(۱۵)

علیگڑھ ہاکی ٹیم کے مشہور رائٹ آؤٹ الطاف صاحب عرف "Willy" سے میری ملاقات نینی تال میں ہوئی۔ باوجود ان کی سفید داڑھی کے میں نے چال ڈھال سے انہیں پہچان لیا۔ اور انہوں نے بھی مجھے پہچان لیا خوب ہنسی خوشی کے بعد انہوں نے بتایا کہ ایک علیگ بھائی ان سے ملے اور کہا کہ میں نے تو آپ کو پہچان لیا ہے آپ بتائیں کہ میں کون

ہوں۔ الطاف صاحب کو اس میں کامیابی نہیں ہوئی۔ مگر وہ صاحب مُصر تھے کہ انہیں پہچانا جائے۔ الطاف صاحب نے تنگ آ کر ان سے پوچھا کہ آپ علیگڑھ میں کسی جماعت میں اول آئے تھے۔ انہوں نے کہا جی نہیں! آپ اسٹوڈنٹس یونین میں تقریر کرتے تھے انہوں نے کہا جی نہیں۔ آپ کوئی کھیل کھیلے تھے انہوں نے کہا جی نہیں الطاف صاحب نے فرمایا کہ جب آپ علیگڑھ میں کچھ بھی نہیں تھے تو میں آپ کو کیسے پہچانتا اور اس میں کیا کمال ہے کہ آپ نے مجھے پہچان لیا جب میں ہاکی کھیلتا تھا تو ہر طرف سے "Well played Willy, Well played Willy" کی صدائیں بلند ہوتی تھیں۔

(۱۶)

علیگڑھ میں کھاتے پیتے گھروں کے لڑکے پڑھائی سے ذرا بے نیاز ہوتے تھے انہیں علیگڑھ سے بڑی محبت ہوتی تھی اور ہنسی خوشی سے وقت گزارتے تھے۔ ظاہر ہے ایسی صورت میں امتحان پاس کرنے کا سوال ہی نہ تھا۔ اس قسم کے ایک لڑکے سے ان کے وطن میں کسی نے پوچھا کہ جناب کا کیا شغل ہے؟ جواب دیا۔ ''میں علیگڑھ میں ایف اے کا امتحان دیا کرتا ہوں''۔

(۱۷)

علیگڑھ کے نامی اولڈ بوائے سید حسن صاحب کالج میں ''بھوندو'' کے نام سے مشہور تھے۔ جن دنوں وہ علیگڑھ میں تحصیلدار ہو کر آئے میں یونیورسٹی پراکٹر تھا۔ علیگڑھ کی نمائش کے موقع پر ان کا ایک سرکاری خط مجھے آیا۔ جو سید حسن تحصیلدار کی طرف سے تھا کہ نمائش کے سلسلے میں یونیورسٹی سے کرسیاں درکار ہیں۔ میں نے اس خط کا جواب مختصر سا دے دیا کہ یونیورسٹی سے کرسیاں نہیں دی جا سکتیں۔ دوسرے دن ان کا پھر اسی سلسلے میں خط آیا اور بجائے سید حسن تحصیلدار کے ''آپ کا بھائی بھوندو'' لکھا ہوا تھا۔ میں نے فوراً جواب دیا کہ

بھوندو صاحب کو کون انکار کر سکتا ہے۔آپ کرسیاں منگالیں۔ بعد میں ان سے نمائش میں ملاقات ہوئی تو فرمایا کہ غلطی ان کی تھی بھلا یونیورسٹی والے تحصیلدار کا کیا نوٹس لیتے'' بھوندو'' کی اور بات ہے۔ میں نے کہا بالکل ٹھیک ہے۔کافی مذاق رہا اور بھوندو صاحب نے کباب پراٹھوں سے خوب تواضع کی۔

(۱۸)

ایک علیگ بھائی بفضل خدا بڑے اونچے عہدے پر فائز تھے۔ان کی طالبعلمی کے ایک ساتھی اپنے ایک عزیز کو لے کران سے ملنے گئے۔ ادھراُدھر کی باتیں اور خوش گپیوں کے بعدان کے ساتھی نے کہا کہ میں اپنے عزیز کو لایا ہوں کہ آپ اسے کوئی اچھی ملازمت عنایت کریں۔ مجھ پہ بڑااحسان ہوگا۔افسر اعلیٰ کچھ سوچ میں پڑ گئے انہوں نے اس عزیز پر ایک گہری نظر ڈالی اور افسری کے لہجہ میں پوچھا"What are his qualifications" ان کے علیگ ساتھی نے ذرا ان کے قریب ہو کر آہستہ سے جواب دیا۔'' وہ ہی جو آپ کی ہیں'' اُس بچے کو فوراً نوکری مل گی!

(۱۹)

ایک مرتبہ علیگڑھ اولڈ بوائز میں الیکشن کا کچھ مسئلہ تھا۔ الیکشن میں دو فریق کا ہونا تو لازمی ہے دونوں طرف سے حضرات دروازے پر موجود تھے اور ہر ووٹر کی جانچ پڑتال کے بعد انہیں اندر جانے دیتے تھے۔ اتنے میں ایک کنجڑا بنیان تہمد باندھے ہوئے آیا۔ایک فریق نے پوچھا کہ کیسے آئے۔ دوسرے فریق نے کہا کہ یہ ہمارے ووٹر ہیں پہلے فریق نے پوچھا کہ یہ آخر ہیں کون؟ دوسرے فریق نے جواب دیا۔آپ ہیں'' تاجر کدو'' اور یہ کہہ کر انہیں کمرہ میں داخل کر دیا۔

ایم اے او کالج کے طلباء میں ''مسعود ٹامی'' کی ایک نہایت مشہور معروف ہستی تھی ان کی شرارتیں بیشمار ہیں۔ ان میں سے حسب ذیل دلچسپی کا باعث ہوں گی...... اسٹریچی ہال میں جلسہ ہو رہا تھا گرمی بے حد و حساب تھی۔ ان دنوں بجلی کے پنکھوں کا زمانہ تو تھا نہیں اس لئے کوئی پنکھی جھل رہا تھا کوئی اخبار ہلا رہا تھا۔ اور ہر طرف گرمی گرمی کی پکار تھی۔ مسعود ٹامی کی نگاہ ایک بزرگ پر پڑی جن کی سفید لمبی داڑھی تھی اور وہ خوب پنکھی جھل رہے تھے اور گرمی گرمی کی دہائی دے رہے تھے۔ مسعود ٹامی کو جو شرارت سوجھی تو ہال سے نکل کر اپنے کمرے میں پہنچے اور ایک سفید لمبی مصنوعی ڈاڑھی لگا کر اسٹریچی ہال واپس آ گئے اور انہی بزرگ کے قریب بیٹھ گئے۔ تھوڑی دیر گرمی کی دہائی دیتے رہے اور پھر مصنوعی ڈاڑھی اتار کر اپنے سامنے رکھ دی۔ وہ بزرگ یہ سب کچھ دیکھ رہے تھے۔ تھوڑی دیر بعد مسعود ٹامی ان سے مخاطب ہوئے اور کہا۔ ''گرمی بہت زیادہ ہے حضور بھی ڈاڑھی اتار کر رکھ دیں'' پھر کیا تھا سننے والوں میں وہ ہنسی رہی کہ خدا کی پناہ!

............☆☆☆............

علی گڑھ کے چند بزرگوں کی یادیں

پیش لفظ

اس سلسلہ میں جن بزرگوں کا ذکر ہے ان کی سوانح حیات یا ان کے کارناموں پر تبصرہ کرنا مقصود نہیں...... میری غرض تو محض ان واقعات تک محدود ہے جو ان بزرگوں کے متعلق میری ذاتی تجربہ سے وابستہ ہیں۔

ایس۔ ایم۔ شفیع

............☆☆☆............

نواب اسحاق خان صاحب

نواب صاحب جب ایم اے او کالج کے آنریری سیکرٹری منتخب ہوئے تو ان کا مستقل قیام میرٹھ میں تھا۔ مگر وہ اکثر چند دنوں کیلئے علیگڑھ تشریف لایا کرتے تھے۔ ہم تینوں بھائی اس زمانہ میں اسکول کے طالب علم تھے جب نواب صاحب علیگڑھ تشریف لاتے تھے تو اسکول کے بورڈنگوں میں لڑکوں کیلئے مٹھائی بھیجا کرتے تھے کہ نواب صاحب نے بچوں کیلئے میٹھائی بھیجی ہے۔ لڑکے ان کی اس عنایت سے بہت خوش ہوتے تھے اور انتظار کرتے رہتے تھے کہ نواب صاحب تشریف لائیں گے تو میٹھائی ملے گی۔ یہ سلسلہ ان سے پہلے اور ان کے بعد کبھی نہیں رہا۔

ریٹائرمنٹ سے قبل نواب صاحب سیشن جج کے عہدہ پر فائز تھے۔ ایک ضلع میں میرے والد صاحب جو ڈاکٹر تھے اور نواب صاحب کا ساتھ ہو گیا تھا۔ علاج کے سلسلے میں والد صاحب کی نواب صاحب سے کافی ملاقات ہو گئی تھے۔ جب والد صاحب برٹش وائس کونسل کی حیثیت سے جدہ میں مقیم تھے اور نواب صاحب کالج کے آنریری سیکرٹری تھے تو والد صاحب نے ہمارے متعلق نواب صاحب کو لکھا۔ ایک دن نواب صاحب کے سیکرٹری

ہمارے بورڈنگ آئے اور فرمایا کہ آئندہ جمعہ کی نماز کے بعد ہم نواب صاحب سے مسجد میں ملیں۔ چنانچہ ہم تینوں بھائی نماز جمعہ کے بعد مسجد میں ٹھہرے رہے کہ نواب صاحب سے ملیں گے۔ لیکن جب کافی دیر ہوگئی اور مسجد تقریباً خالی ہوگئی تو ہم نے نواب صاحب کے متعلق دریافت کیا۔ معلوم ہوا نواب صاحب وظیفہ میں مشغول ہیں۔ ہم مسجد کے صحن میں انتظار کرتے رہے کوئی ڈیڑھ دو گھنٹے بعد جب نواب صاحب مسجد کے صحن میں آئے تو ہم ان سے ملے اور کہا کہ ان کے فرمانے کے مطابق ہم حاضر ہو گئے ہیں۔ نواب صاحب بہت خوش ہوئے اور فرمایا کہ ہم ان کے ساتھ کوٹھی چلیں چنانچہ ہم موٹر میں ان کے ساتھ گئے نواب صاحب نے والد صاحب کے خط کا ذکر کیا اور ہمیں بڑی پُر تکلف چائے پلائی اور فرمایا کہ کوئی دقت ہو تو انہیں بتائیں۔ پھر انہوں نے دریافت کیا کہ آیا ہم نے قرآن شریف پڑھا ہے؟ ہم نے منفی میں جواب دیا۔ تو پوچھا کہ کیا اسکول کے بورڈنگ میں قرآن شریف پڑھایا جاتا ہے؟ ہم نے پھر نفی میں جواب دیا۔ تو فرمایا کہ اس کا انتظام کیا جائے گا۔ اس کے بعد معلوم ہوا کہ نواب صاحب نے حکم جاری کیا ہے کہ اسکول کے بورڈنگ کے پیش امام صاحب بعد نماز فجر بچوں کو قرآن شریف پڑھایا کریں۔ اس طرح ہم نے بھی قرآن شریف پڑھا۔

نواب صاحب کے زمانہ میں یوپی کے گورنر (جمیس مسٹن) علیگڑھ تشریف لائے تھے یہاں آنے سے قبل وہ بنارس بھی تشریف لے گئے تھے اور وہاں ہندو کالج کو کچھ روپیہ بھی عنایت کیا تھا۔ علیگڑھ میں ان کے شایانِ شان خاطر تواضع کی گئی اور ایڈریس بھی پیش کیا گیا۔ ایڈریس کے بعد نواب صاحب نے حسب ذیل شعر پڑھا۔

گل پھینکے ہے اوروں کی طرف بلکہ ثمر بھی
اے خانہ بر انداز چمن کچھ تو ادھر بھی

مسٹن صاحب اردو جانتے تھے اس شعر کا مطلب سمجھ گئے اور اس میں جو اشارہ تھا اسے بھی سمجھ گئے۔ خود ہنسے اور ان کے ساتھ اسٹریچی ہال میں حاضرین بھی خوب ہنسے۔ مسٹن صاحب نے غالباً اس قدر رقم جو بنارس میں دی تھی علیگڑھ کو بھی عطا کی۔

اپنے علیگڑھ کے قیام میں ایک دفعہ نواب صاحب بی اے کی کلاس میں تشریف لائے جہاں انگریز پروفیسر ورڈس ورتھ کی پوئٹری پڑھا رہے تھے اور ورڈس ورتھ کے معرفت کا رجحان سمجھا رہے تھے۔ نواب صاحب خاموشی سے لیکچر سنتے رہے۔ جب لیکچر ختم ہوا تو نواب صاحب نے یہ شعر پڑھا۔

برگِ درختانِ سبز در نظر ہوشیار
ہر ورق دفتریست معرفتِ کردگار

حافظ شیرازی

اور اس کا مطلب انگریزی زبان میں پروفیسر صاحب کو بتایا اور ان سے پوچھا کہ کیا ایسا کوئی شعر انگریزی زبان میں ہے۔ پروفیسر صاحب نے جواب دیا کہ اس پائے کا معرفت کا شعر جہاں تک انہیں معلوم ہے انگریزی زبان میں نہیں ہے۔

............☆☆☆............

مولانا سلیمان اشرف صاحب

مولانا صاحب نہایت عالم اور فاضل بزرگ تھے اور علیگڑھ میں دینیات کے استاد
تھے۔ وعظ بہت عمدہ فرماتے تھے اور اس سلسلہ میں علیگڑھ کے علاوہ دوسرے شہروں میں بھی
مدعو کئے جاتے تھے خدا نے انہیں حسن سیرت کے ساتھ حسن صورت بھی عطا کیا تھا۔ عجیب
اتفاق ہے کہ ۱۹۰۹ء میں جس دن جس ٹرین سے ہم تینوں بھائی اسکول میں داخلہ کیلئے
علیگڑھ پہنچے اسی دن اسی ٹرین سے مولانا صاحب ایم اے او کالج میں ملازمت کے سلسلے میں
علیگڑھ پہنچے۔ ٹرین غالباً رات کے تین بجے علیگڑھ پہنچی تھی اور ہم نے اور مولانا صاحب نے
ایک ہی ویٹنگ روم میں صبح تک قیام کیا تھا۔ مولانا صاحب اکثر ہنسی میں فرمایا کرتے تھے کہ
ہم نے اور تم نے ساتھ ہی ساتھ علیگڑھ میں داخلہ لیا تھا۔ جب میں نے اسکول کے بعد کالج
میں داخلہ لیا تو مولانا صاحب سے زیادہ ملنے کا موقع ملا۔ مولانا صاحب کا علیگڑھ میں قیام
شروع سے آخر تک آدم جی پیر بھائی منزل میں رہا اور ان کی وفات کے بعد یونیورسٹی نے
وہاں ایک کتبہ نصب کرا دیا کہ اس عمارت میں مولانا صاحب کا اتنی مدت قیام رہا۔ کالج میں
میرا ایک مضمون فارسی تھا۔ اور چونکہ مجھے اس مضمون میں ذرا دشواری ہوتی تھی میں نے اس

کا ذکر مولانا صاحب سے کیا تو نہایت شفقت سے فرمایا کہ مغرب کے بعد آ کر پڑھ لیا کرو۔ چنانچہ میں ایسا ہی کرتا رہا اور یہ سلسلہ بی اے تک جاری رہا۔ کبھی کبھی مولانا صاحب پڑھنے کے بعد روک لیتے تھے کہ آج یہیں کھانا کھاؤ۔ مولانا صاحب کھانا فرش پر کھایا کرتے تھے اور خاص بات یہ تھی کہ ایک وقت میں صرف ایک چیز کھاتے تھے یعنی اگر چاول ہے تو صرف چاول اور اگر قورمہ چپاتی ہے تو صرف وہی۔ وہ فرماتے تھے کہ ہر کھانے کے ہضم کا وقت مختلف ہوتا ہے اس لئے ایک چیز کھانی چاہیے تاکہ ایک وقت میں ہضم ہو جائے۔ مولانا صاحب کھانا بہت عمدہ کھاتے تھے اور اس میں شبہ نہیں کہ ان کے یہاں کھانا بہت لذیذ پکتا تھا۔ مولانا صاحب کے پانی پینے کا طریقہ کچھ ان کا اپنا ہی تھا۔ وہ پانی کھانے کے بعد پیتے تھے اور اس طرح کہ صراحی ہاتھ میں لے کر بازو کی پوری لمبائی تک اوپر لیجاتے تھے اور اس اونچائی سے صراحی کا پانی الٹتے تھے اور اس کمال کے ساتھ کہ پانی کی دھار سیدھے ان کے حلق میں جاتی تھی اور ایک بوند ادھر اُدھر نہ گرتی تھی۔ لڑکے اکثر ان کے پانی پینے کے طریقہ کی نقل کرتے تھے اور سب پانی ان کے کپڑوں پر گرتا تھا۔ جہاں تک مجھے علم ہے کسی لڑکے کو بھی مولانا صاحب کی طرح پانی پینے میں کامیابی نہیں ہوئی۔ مولانا صاحب اپنی شفقت سے طلباء کو ہمیشہ اچھی باتوں کی نصیحت فرمایا کرتے تھے اور لڑکے ان کی بات کا بہت لحاظ کرتے تھے۔

جب میں انگلستان سے واپس آیا اور ملازمت کے سلسلے میں علیگڑھ پہنچا تو مولانا صاحب سے ملا وہ بہت خوش ہوئے اور پوچھا کہ کیا پاس کیا ہے۔ میں نے کہا کہ ایل ایس ای سے اکنامکس کی ڈگری حاصل کی ہے اور مڈل ٹمپل سے بیرسٹری بھی پاس کی ہے۔ فرمانے لگے بیرسٹری کرو۔ اس میں روپیہ پیسہ بھی ہے ہوم ممبری اور ہائی کورٹ کی ججی وغیرہ

بھی ہے۔ میں نے کہا کہ میں تو ٹیچنگ لائن اختیار کرنا چاہتا ہوں اور وہ بھی علیگڑھ یونیورسٹی میں۔ فرمانے لگے اگر ایسا خیال ہے تو فقیر کی بات یاد رکھو۔ طلباء کا امتحان تو سال میں ایک بار ہوتا ہے مگر استاد کا امتحان کلاس میں ہر روز ہوتا ہے ان کی اس نصیحت کا مجھ پر بہت اثر ہوا اور میں نے کوشش کی کہ کلاس کے امتحان میں کامیابی حاصل ہوتی رہے۔

یونیورسٹی کے ایک استاد کچھ دہریت کی طرف مائل تھے۔ ایک دن اس مسئلہ پر انہوں نے مولانا صاحب سے بحث شروع کردی۔ مولانا صاحب سمجھ گئے کہ وہ استاد مذہب سے زیادہ واقف نہیں اس لئے ان سے علمی بحث بیکار ہوگی۔ انہیں دوسری طرح قائل کرنا چاہیے۔ فرمایا کہ آپ دہریت کے حامی ہیں اور خدا رسولؐ اور جزاوسزا میں اعتقاد نہیں رکھتے۔ ہم تو بھئی مسلمان ہیں اور ان سب باتوں پر اعتقاد رکھتے ہیں۔ فرض کرو آپ صحیح نکلے تو ہمیں کیا نقصان ہوگا اور اگر بھئی ہم صحیح نکلے تو آپ بتائیں کہ آپ کا کیا حشر ہوگا۔ وہ استاد لاجواب ہو گئے اور مولانا صاحب نے یوں بحث ختم کردی۔

..........☆☆☆..........

صاحبزادہ آفتاب احمد خان صاحب

صاحبزادہ صاحب جب لندن میں انڈیا کونسل کے ممبر تھے، میں اسی زمانہ میں لندن اسکول آف اکنامکس میں طالب علم تھا۔ صاحبزادہ صاحب کو اکنامکس سے گہری دلچسپی تھی اور ان کی خواہش تھی کہ کوئی ایسا شخص ملے جو علیگڑھ کا پڑھا ہوا ہو اور آج کل لندن میں اکنامکس پڑھتا ہو۔ اس سلسلہ میں ان کو میرے متعلق اطلاع ملی اور انہوں نے مجھے کہلوایا کہ فلاں دن تیسرے پہر میں ان کے فلیٹ میں ان سے ملوں۔ چنانچہ میں مقررہ دن اور وقت پر ان کے یہاں پہنچ گیا۔ صاحبزادہ صاحب بڑی شفقت سے ملے اور علیگڑھ کی باتیں کرتے رہے۔ پھر فرمایا کہ جس طرح انسان جسم اور روح رکھتا ہے اسی طرح ایک قوم بھی جسم اور روح رکھتی ہے۔ قوم کا جسم اس کی فوج ہوتی ہے اور اس کی روح اکنامکس ہے۔ اور مجھے کہا کہ بڑی خوشی ہے کہ آپ یہاں اکنامکس پڑھ رہے ہیں۔ میں چاہتا ہوں کہ اکنامکس کے متعلق مجھے جو دشواری ہو آپ مجھے سمجھا دیا کریں۔ پھر فرمایا کہ چلو آج سیر کو چلتے ہیں۔ تقریباً ڈیڑھ دو گھنٹے کی سیر کے بعد جب واپس ہوئے تو میں نے اجازت چاہی۔ فرمایا کہ کھانا کھا کر جانا میں تو پرہیزی کھاتا ہوں مگر تمہارے لئے آج کھانا پکوایا ہے۔ غرض نہایت

نفیس پلاؤ، مرغ کا قورمہ، چپاتی اور پڈنگ وغیرہ کھلائے اور فرماتے رہے کہ اور کھائیے۔آپ نوجوان ہیں آپ کھا سکتے ہیں۔پھر فرمایا کہ ہراتوار کو آجایا کیجئے اکنامکس پر گفتگو رہا کرے گی۔ اور اس دن آپ کھانا یہیں کھائیں اور جو کھانا ہو میرے باورچی ابراہیم کو کہہ دیا کریں۔ میں نے عرض کیا کہ ہفتہ میں صرف اتوار کو چھٹی ہوتی ہے اس دن اور بھی کام ہوتے ہیں۔ میں ایک اتوار چھوڑ کر حاضر ہو جایا کروں گا۔فرمایا کہ ٹھیک ہے چلتے وقت ابراہیم نے کھانے کے متعلق پوچھا تو میں نے کہا کہ آپ اپنے فن کے ماہر ہیں میں کیا بتاؤں جو مناسب ہو پکالیا کرنا۔ یہ سلسلہ کافی مدت تک جاری رہا۔صاجبزادہ صاحب ایڈم اسمتھ ،التھس رکارڈ، سپلائی وڈیمانڈ، فارن ایکس چینج وغیرہ کے متعلق سوالات کرتے تھےاور میں ان کو مطمئن کرنے کی کوشش کرتا تھا۔ غالباً ۱۹۲۴ء میں انڈیا کونسل کی ممبری ختم ہونے پر صاجبزادہ صاحب علیگڑھ تشریف لے گئے تھےاور وہاں یونیورسٹی کے وائس چانسلر منتخب ہو گئے تھے۔ ۱۹۲۶ء میں انہوں نے میرے والد صاحب کو لکھا تھا کہ جیسے میں انگلستان سے واپس آؤں وہ مجھے ملازمت کے سلسلے میں علیگڑھ بھیج دیں۔ صاجبزادہ صاحب کو علیگڑھ سے بڑی محبت تھی اور اکثر علیگڑھ کے متعلق گفتگو کیا کرتے تھے۔

"یوم سرسید" کے موقع پر غالباً ۱۹۲۳ء میں انہوں نے لندن کے مشہور ہوٹل سوائے میں علیگڑھ لنچ کا انتظام کیا۔تمام علیگ طلباء نے اوران کے علاوہ علیگ حضرات جوانگلستان میں موجود تھے چندہ دیا اور لنچ میں شریک ہوئے۔ مہمانانِ گرامی میں رائٹ آنریبل امیر علی صاحب، سرعلی امام صاحب سیکرٹری آف اسٹیٹ فار انڈیا اور دیگر حضرات نے شرکت فرمائی۔ صاجبزادہ صاحب نے سرسید اور علیگڑھ پر پُر مغز تقریر کی۔ غرض کہ لنچ نہایت کامیاب رہا۔ لنچ کے بعد مہمان رخصت ہو گئے تو صاجبزادہ صاحب بھی اپنا ہیٹ اور کوٹ

لینے کیلئے کلوک روم کے اٹنڈ نٹ کو ہاف کراؤن مجھ سے لے کر بطور ٹپ دیا اس کے بعد میری جب ان سے ملاقات ہوئی تو فوراً جیب سے ہاف کراؤن نکال کر مجھے دینے لگے۔ میں نے کچھ تامل کیا تو فرمایا کہ یہ تو تم کو لینا ہی ہوگا۔ اس وقت میرے پاس نہیں تھا تو میں نے لے لیا تھا۔ اور پھر یہ ہاف کراؤن اپنی جیب میں رکھ لیا تھا کہ جب تم سے ملاقات ہوگی واپس کر دوں گا۔

ایک موقع پر میں نے صاحبزادہ صاحب سے درخواست کی کہ وہ میرے ساتھ چائے پینا منظور کریں اور یہ کہ چائے اس گھر میں ہوگی جہاں میں رہتا تھا۔ صاحبزادہ صاحب نے اسے منظور کر لیا اور کہا کہ میں دیکھنا بھی چاہتا ہوں کہ طلباء لندن میں کیسے گھرانوں میں رہتے ہیں۔ جب میں نے اپنے لینڈ لارڈ اور لینڈ لیڈی سے اس کا ذکر کیا تو وہ بہت خوش ہوئے کہ اتنے بڑے آدمی وہاں تشریف لائیں گے۔ دعوت کے مقررہ دن مقررہ وقت پر گھنٹی بجی تو میں دروازہ پر پہنچا اور دیکھا کہ صاحبزادہ صاحب تشریف لائے ہیں۔ میری طرف ہاتھ بڑھا کر فرمایا کہ مجھے کافی حرارت ہے اور میں اس حالت میں آ گیا ہوں کہ وعدہ خلافی نہ ہو اور نیز آپ کی دل شکنی نہ ہو۔ گھر کو دیکھ کر اور لینڈ لارڈ اور لینڈ لیڈی سے مل کر بہت خوش ہوئے اور تھوڑی دیر بعد کہا کہ میں اور ٹھہرتا مگر میری طبیعت خراب ہے اور اسلئے میں جانا چاہتا ہوں۔ مجھے یہ اور ٹپ کا واقعہ اب تک یاد ہے۔

............☆☆☆............

ڈپٹی حبیب اللہ خان صاحب

ڈپٹی صاحب علیگڑھ کے ان اولڈ بوائز میں سے تھے جنہیں علیگڑھ سے دلی لگاؤ تھا۔ ملازمت سے ریٹائرمنٹ پر انہوں نے علیگڑھ میں رہائش اختیار کی اور وہاں ایک عالیشان دومنزلہ کوٹھی بنوائی اور وصیت کردی کہ ان کے بعد یہ کوٹھی یونیورسٹی کی ملکیت ہوگی ان کے دوستوں میں صاحبزادہ آفتاب احمد خان صاحب، میر ولایت حسین صاحب اور قاضی عزیز الدین بلگرامی صاحب کا بہت خاص مقام تھا۔ اپنی کوٹھی کا نام انہوں نے میر ولایت حسین کے نام پر "ولایت منزل" رکھا تھا۔ صاحبزادہ آفتا احمد خان صاحب کی یاد میں انہوں نے اولڈ بوائز سے چندہ فراہم کر کے ایک دومنزلہ ہوسٹل تعمیر کرا دیا جو "آفتاب ہوسٹل" کے نام سے موسوم ہوا۔ اور اس کے روم رینٹ کی رقم سے اولڈ بوائز کے مستحق بچوں کو وظیفہ ملنے لگا۔

ڈپٹی صاحب سے میری پہلی ملاقات کا واقعہ عجیب دلچسپ ہے۔ ۱۹۲۷ء میں جب علیگڑھ یونیورسٹی میں ملازم ہوا تو اکیڈیمک کونسل کا ممبر بھی منتخب ہوا۔ اور میں نے کونسل کی میٹنگ میں پہلی بار حبیب اللہ خان صاحب اور ڈیپارٹمنٹ کے چیئرمین ڈاکٹر سر ضیاء الدین کا دیکھا۔ میٹنگ کے دوران کسی مسئلہ پر بحث ہو رہی تھی۔ میں نے بھی اس میں حصہ لیا اور

جو کچھ کہا وہ صاحبزادہ صاحب کیخلاف اور ڈاکٹر صاحب کی موافقت میں تھا۔ کوئی گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ کے بعد کسی اور مسئلہ پر بحث ہوئی اور اس میں بھی میں نے حصہ لیا اور جو کچھ کہا وہ صاحبزادہ صاحب کی موافقت اور ڈاکٹر صاحب کی مخالفت میں تھا۔ جب میٹنگ ختم ہوئی تو ڈپٹی صاحب اپنی جگہ سے اٹھ کر میرے پاس آئے اور مجھ سے لپٹ گئے۔ مجھے کچھ حیرت ہوئی تو انہوں نے فرمایا کہ آپ کے متعلق کچھ لوگوں کا خیال تھا کہ آپ ڈاکٹر صاحب کی پارٹی میں ہیں اور کچھ اور لوگوں کا خیال تھا کہ آپ صاحبزادہ صاحب کی پارٹی میں ہیں۔ مگر میٹنگ میں آپ کے رویہ سے ظاہر ہوا کہ آپ نہ ایک پارٹی میں ہیں اور نہ دوسری میں۔ آپ اپنے خیال میں جو صحیح بات ہو اس کے حامی ہیں اور یونیورسٹی کے بہی خواہ ہیں۔ دراصل حقیقت بھی یہ ہی ہے۔ کچھ اپنی خاندانی روایات کی وجہ سے اور کچھ ہاکی کھیلنے سے سپورٹسمین شپ کی بنیاد پر میں نے پارٹی بازی سے کوئی سروکار نہیں رکھا اور اپنی زندگی میں ہمیشہ جس بات کو صحیح سمجھا اس کا ساتھ دیا اور قاعدہ قانون کی سختی سے پابندی کی۔

اکیڈیمک کونسل کے واقعہ کے بعد میں اکثر ڈپٹی صاحب سے ملتا رہا اور وہ بڑی محبت سے پیش آتے تھے۔ گو وہ صاحبزادہ صاحب کے زبردست حامی تھے اور اتنی ہی شدت سے ڈاکٹر صاحب کے مخالف تھے مگر مجھ سے کبھی اس قسم کی کوئی بات نہیں کی۔ ان کا کردار اس قدر بلند تھا کہ جب انہیں یہ اطلاع ملی کہ ڈاکٹر صاحب کا انگلستان میں انتقال ہو گیا تو ڈاکٹر صاحب کے خلاف جو کچھ مواد ان کے پاس جمع تھا سب کو اکٹھا کیا اور اس پر مٹی کا تیل چھڑک کر اس کو آگ لگا دی اور فرمایا کہ جو شخص اس دنیا میں نہیں رہا اس سے مخالفت کیسی؟
جب میں اسٹوڈنٹس یونین کا ٹریژرر تھا تو سرسید کے زمانہ کا نہایت شاندار فوارہ جو بیکار پڑا تھا میں نے اسے یونین کے لان میں لگوا دیا۔ اور اب چونکہ علیگڑھ میں واٹر ورکس ہو گیا تھا

اس لئے اس فوارہ میں پانی چل پڑا۔ جب ڈپٹی صاحب کو اس کا علم ہوا تو انہوں نے مجھ سے فرمایا کہ یہ فوارہ سرسید نے سوسائٹی گارڈن میں نصب کرایا تھا۔ مگر پانی کی کمی سے چل نہ سکا۔ پھر صاحبزادہ صاحب نے اسے سوئمنگ باتھ لان میں لگوایا۔ مگر وہاں بھی پانی میں پریشر کی کمی سے چل نہ سکا۔ پھر جب سوئمنگ باتھ لان پر اور زیادہ ٹینس کورٹ بنوانے کی ضرورت پڑی تو اس فوارہ کو وہاں سے ہٹا دیا گیا تھا۔ اب سنا ہے کہ آپ نے اسے یونین لان میں لگوادیا ہے اور اس میں پانی بھی چل رہا ہے۔ میں اسے دیکھنا چاہتا ہوں۔ میں نے کہا کہ جب آپ فرمائیں میں آپ کے ساتھ وہاں چلوں گا۔ فرمایا کہ آئندہ جمعہ کی نماز کے بعد مناسب رہے گا۔ چنانچہ آئندہ جمعہ کی نماز کے بعد مسجد سے ڈپٹی صاحب اور میں یونین لان پر آئے۔ اور اس فوارے میں پانی چلتا ہوا دیکھ کر وہ بہت خوش ہوئے اور فرمایا کہ آپ نے بڑا اچھا کام کیا ہے۔ میں نے کہا کہ خدا کی مہربانی ہے کہ ایسا ہو سکا۔

۱۹۵۹ء میں جب میں پاکستان آنے لگا تو میں ڈپٹی صاحب سے ملنے گیا۔ وہ بڑی شفقت سے ملے اور فرمایا کہ یونیورسٹی تو ہمیشہ آپ کیلئے کھلی ہے۔ اور اپنی کوٹھی طرف اشارہ کر کے کہا کہ اس گھر کے دروازے بھی ہر وقت آپ کیلئے کھلے ہیں۔ ان کے ان محبت بھرے الفاظ کا مجھ پر بہت اثر ہوا جو مجھے ہمیشہ یاد رہیں گے۔

..........☆☆☆..........

قاضی عزیز الدین احمد بلگرامی

قاضی صاحب نہایت قابل، ایماندار اور فرض شناس انسان تھے۔ بڑی سادہ زندگی گزارتے تھے۔ اپنے کام میں قاعدہ قانون کے سخت پابند تھے۔ مشکل یہ تھی کہ اوروں کو بھی اپنے معیار سے پرکھتے تھے اور ظاہر ہے کہ بہت ہی کم لوگ اس پر پورے اترتے تھے۔

علیگڑھ سے ان کو بہت زیادہ محبت تھی۔ سرکاری ملازمت سے ریٹائرمنٹ پر انہوں نے اپنا پورا اندوختہ علی گڑھ میں اپنی عالیشان کوٹھی کی تعمیر پر صرف کر دیا۔ اس کوٹھی کے اوپر "اللہ" لکھوا دیا تھا۔ اور اس لئے وہ "اللہ والی کوٹھی" کے نام سے مشہور تھی۔

مستقل ملازمت سے ریٹائرمنٹ کے بعد حکومت نے انہیں غالباً پانچ سال کیلئے تین ہزار روپیہ ماہوار پر بندوبست کے کام کے سلسلے میں مامور کر دیا تھا۔ اسی زمانہ میں علیگڑھ یونیورسٹی کو ٹریژرر کے عہدہ کیلئے ان کی خدمات کی ضرورت محسوس ہوئی۔ جب ان کو ان کے متعلق ان کے دوست ڈپٹی حبیب اللہ خان کے ذریعہ اطلاع ملی تو انہوں نے اپنی ملازمت سے استعفیٰ دے دیا اور علی گڑھ میں بلا کسی معاوضہ کے یونیورسٹی ٹریژرر کا عہدہ سنبھال لیا اور یہ اس صورت میں جبکہ ان کی مالی حالت اچھی نہ تھی۔ یونیورسٹی نے بہت کوشش کی کہ وہ کچھ

آنزیریم قبول کرلیں مگرانہوں نے انکار کردیا۔ کہ وہ یونیورسٹی سے کسی معاوضہ کیلئے تیارنہیں ہیں۔

ان کی کوٹھی یونیورسٹی سے تقریباً ایک میل دور ہوگی اور وہ اپنی کوٹھی سے یونیورسٹی اور یونیورسٹی سے اپنی کوٹھی پیدل آتے جاتے تھےاور دوپہر کے وقت ڈائننگ ہال سے آٹھ آنے گیسٹ ٹکٹ پر کھانا منگوا کر دفتر ہی میں نوش کر لیتے تھے۔ یونیورسٹی کا کام اس قدر انہماک اور تندہی سے کرتے تھے کہ ہرایک کو تعجب ہوتا تھا۔ میں اس زمانہ میں اپنے ڈیپارٹمنٹ کا صدر ہونے کے علاوہ کچھ مدت سرسید ہال کا پرووسٹ رہا کچھ مدت یونیورسٹی پراکٹر اور ساتھ ہی ساتھ رائیڈنگ کلب کا پریذیڈنٹ اور اسٹوڈنٹس کا ٹریژرر بھی تھا۔ ظاہر ہے کہ ان سب کاموں کے سلسلے میں یونیورسٹی ٹریژرر سے سابقہ پڑتا رہتا تھا۔

ایک دن قاضی صاحب کے صاحبزادے مظہرالدین احمد صاحب بلگرامی جو قاہرہ میں عربی اور دینیات کی تعلیم حاصل کر کے علیگڑھ یونیورسٹی کے شعبہ دینیات میں استاد مقرر ہوئے تھے میرے یہاں تشریف لائے۔ ادھراُدھر کی گفتگو کے بعد انہوں نے فرمایا کہ آپ تو جانتے ہی ہوں گے کہ والد صاحب کا اپنا ایک معیار ہے اور لوگ اس پر پورے نہیں اترتے۔ البتہ آپ کی حد درجہ تعریف کرتے رہتے ہیں اس لئے مجھے خواہش ہوئی کہ ایسے شخص سے ملنا چاہیے جن کی والد صاحب اس قدر تعریف کرتے ہیں۔ میں نے کہا کہ یہ ان کی مہربانی ہے۔ انہوں نے فرمایا کہ ایسانہیں ہے والد صاحب جب تک کسی کو ہر طرح دیکھ بھال نہ لیں اس کے متعلق کلمۂ خیر کبھی نہیں کہتے۔

ایک اور واقعہ یوں ہے کہ یونیورسٹی کے مکانات اسٹاف کو کرائے پر دینے کیلئے ایک الاٹمنٹ کمیٹی ہے۔ اس کے ممبر ٹریژرر صاحب ہیں اور ان دنوں اسٹاف کی طرف سے میں

نمائندہ تھا۔ اوراس کمیٹی کی میٹنگ وائس چانسلر صاحب کی صدارت میں ہوتی ہے۔ مکانات خالی ہونے پر اساتذہ سے درخواستیں طلب کی جاتی ہیں اور ان سے انٹرویو کے بعد مکان الاٹ کئے جاتے ہیں۔ ایک استاد جو علی گڑھ میں کچھ عرصہ سے ملازم تھے اور مزید تعلیم کیلئے انگلستان تشریف لے گئے تھے وہاں سے واپسی پر انہوں نے بھی ایک مکان کیلئے درخواست دی تھی۔ چونکہ ان کو یقین تھا کہ انہیں وہ مکان ضرور الاٹ ہو جائیگا اور انہیں مکان کی دقت تھی۔ اس لئے وہ بلا اجازت اس مکان میں داخل ہو گئے اور معہ بیوی بچوں کے اس میں رہائش اختیار کر لی۔ قاضی صاحب کو یہ بات بے قاعدہ ہونے کی وجہ سے بہت بری لگی۔ جب ہاؤس الاٹمنٹ کمیٹی کی میٹنگ ہوئی تو قاضی صاحب نے وائس چانسلر صاحب سے ان استاد کی اس حرکت کا ذکر کیا اور کہا کہ ان کو مکان ہرگز الاٹ نہیں کیا جائے گا۔ وائس چانسلر (ڈاکٹر ذاکر حسین خان صاحب) نے کچھ معاملہ کو سلجھانے کی کوشش کی۔ مگر قاضی صاحب اس درجہ مصر تھے کہ کچھ پیش نہ چلی۔ انٹرویو کے وقت ان استاد کو اس کے متعلق کہا گیا کہ یہ بہت غلط بات تھی اس لئے انہیں مکان الاٹ نہیں کیا جائے گا وہ بہت کچھ اپنی دشواری بیان کرتے رہے مگر کچھ نتیجہ نہ نکلا اور مکان انہیں الاٹ نہیں کیا گیا۔

میٹنگ کے اختتام پر وائس چانسلر صاحب نے بہت ہی ہمدردی کے لہجہ میں قاضی صاحب سے کہا کہ اس استاد کی حرکت تو اچھی نہ تھی اور اس لئے ان کو مکان الاٹ نہیں کیا گیا مگر میں سوچتا ہوں کہ وہ کیا کریگا؟ قاضی صاحب نے نہایت خشک لہجہ میں جواب دیا کہ آپ ایسا سوچتے ہی کیوں ہیں؟

علیگڑھ کے کچھ طالب علم ساتھی

علی گڑھ کا ایک فیض

علی گڑھ مسلمانوں کا واحد اقامتی تعلیمی ادارہ ہونے کی وجہ سے مختلف صوبوں کے طلباء کو آپس میں ملنے جلنے کے بے شمار مواقع فراہم کرتا ہے۔ علیک سلیک تو آپس میں سبھی سے ہوتی ہے مگر طبیعتوں کی مناسبت سے ایک چھوٹا سا گروپ بھی بن جاتا ہے جسے ایک دوسرے کا حقیقی دوست کہنا درست ہوگا۔ اس گروپ کی بے لوث دوستی مدت العمر قائم رہتی ہے۔ اور یہ علیگڑھ کا ایک عظیم فیض ہے۔

ایس۔ ایم۔ شفیع

منظور حسین اور خلیل اللہ خان

جب میں نے کالج میں سرسید کورٹ کمرہ نمبر ۵۷ میں داخلہ لیا تو میرے دو اور روم فیلو تھے منظور اور خلیل، یہ دونوں میرے اسکول کے ساتھی تو تھے مگر یہ ممتاز بورڈنگ میں رہتے تھے۔اور میں میکڈانل ہاؤس میں بہر حال کالج میں ہم روم فیلو ہو گئے۔ میرا تعلق آبائی وطن کے لحاظ سے پنجاب اور رہائش کے لحاظ سے یوپی سے، منظور کا بہار سے اور خلیل کا سی پی سے تھا۔مختلف صوبوں کے طلباء کو یکجا رکھنا علیگڑھ کی روایت کے عین مطابق ہے۔منظور کو بیک روم پسند تھا اس لئے انہوں نے اس کو سنبھال لیا۔خلیل اور میں نے فرنٹ روم میں رہائش اختیار کی۔منظور، خلیل اور میں روم فیلو تو تھے ہی مگر اس کے علاوہ آپس میں بہت محبت اور میل ملاپ تھا لیکن یہ عجیب بات تھی کہ ہر ایک کی غیر نصابی سرگرمی الگ الگ تھی۔ مجھے ہاکی سے دلچسپی تھی اور میں روز سہ پہر کو ''پک اپ'' میں شریک ہوتا تھا۔خلیل کو ''واک'' کا شوق تھا اور ان کا سہ پہر کا یہ مشغلہ تھا۔منظور کو گپ لگانے سے دلچسپی تھی اور وہ اس قسم کے حضرات میں بیٹھ کر اس شغل میں وقت گزارتے تھے۔منظور کچھ حسابی کتابی واقع ہوئے تھے اس لئے ہم نے متفقہ طور پر فیصلہ کیا تھا کہ صبح کا ناشتہ، شام کی چائے اور کبھی کبھی رات کے کھانے پر مرغ

کا قورمہ یا پلاؤ وغیرہ کا انتظام ان کے سپرد ہے۔ ہم تینوں کو گھروں سے سو سو روپیہ آیا کرتا تھا اس میں سے تقریباً چالیس روپیہ ہوسٹل اور کالج کی فیس ادا کی جاتی تھی اور تقریباً پچیس روپیہ اپنے ذاتی اخراجات کیلئے رکھ کر پینتیس روپیہ منظور کے سپرد کر دیئے جاتے تھے۔ جس میں وہ ناشتہ چائے وغیرہ کا بہت عمدہ انتظام کرتے تھے۔ منظور کے پاس وہائٹ وے لیڈ لے قسم کی کمپنیوں کے ''السٹرٹیڈ کیٹلاگ'' بھی ہوتے تھے اور اگر کسی مہینے حساب کے کچھ روپیہ بچ گئے تو وہ ان کمپنیوں سے پیڈ یا قلم وغیرہ جیسی چیزیں منگوا کر ہمیں دے دیا کرتے تھے غرض کہ چند سال بڑی ہنسی خوشی سے گزرے۔

۱۹۱۸ء کے اخیر میں تمام ملک میں انفلوئنزا کی وبا پھیلی اور کالج بند کر دیا گیا خلیل اور میں تو اپنے اپنے گھروں کو چلے گئے مگر منظور علیگڑھ میں ہی رہے جب ہم واپس کالج آئے تو یہ رنج دہ خبر ملی کہ منظور کا انفلوئنزا میں انتقال ہو گیا۔ خلیل اور مجھ پر اس کا بہت گہرا اثر ہوا اور ہمارے کئی برسوں کا سلسلہ درہم برہم ہو گیا۔ منظور کے متعلق سوائے اس کے اور کیا کہا جا سکتا ہے کہ:

حسرت ان غنچوں پہ ہے جو بن کھلے مرجھا گئے

اس کے کچھ عرصہ بعد میرے منجھلے بھائی (ایس ایم یامین صاحب) نے فرسٹ ائیر میں داخلہ لیا اور ہم دونوں نے کمرہ نمبر ۵۵ میں رہائش اختیار کی خلیل اس عرصہ میں کالج سے چلے گئے تھے۔ یامین نے ۱۹۲۱ء میں ایف ایس سی پاس کی اور انجینئر نگ کیلئے گلاسگو چلے گئے میں نے ۱۹۲۲ء میں بی اے پاس کی اور اسی سال لندن روانہ ہو گیا اور لندن اسکول آف اکنامکس میں داخلہ حاصل کیا اور کچھ عرصہ بعد والد صاحب کے اصرار پر بیرسٹری کیلئے مڈل ٹمپل میں بھی داخلہ لے لیا۔ جب میں انگلستان میں تھا تو معلوم ہوا کہ خلیل پھر علیگڑھ آئے

اور وہاں سے ایل ایل بی پاس کیا اور اپنے آبائی وطن بلدانہ میں وکالت شروع کر دی۔ میں ۱۹۲۶ء کے اخیر میں انگلستان سے واپس آیا اور علیگڑھ یونیورسٹی میں ملازمت اختیار کی۔ چند سال بعد میرا حیدر آباد (دکن) جانا ہوا تو وہاں طالب علمی کے ساتھیوں سے معلوم ہوا کہ خلیل کا عالم شباب میں انتقال ہو گیا۔ اس خبر سے از حد رنج ہوا۔ سوائے صبر کے اور کیا چارہ تھا خدا کی مصلحت میں کسی کا دخل نہیں۔

آدمی بلبلہ ہے پانی کا
کیا بھروسا ہے زندگانی کا

............☆☆☆............

عبداللہ پاشا اور مرزا مصطفےٰ بیگ

پاشا مدراس کے رہنے والے تھے اور مسطو حیدر آباد (دکن) کے۔ پاشا کے چچا (سرامین جنگ بہادر) نظام کے چیف سیکرٹری کے عہدہ پر فائز تھے اور انہوں نے حیدر آباد میں سکونت اختیار کر لی تھی۔ آگے چل کر پاشا کی شادی اپنے انہی چچا کی صاحبزادی سے ہو گئی اور انہوں نے بھی حیدر آباد میں وکالت شروع کر لی۔ مسطو کے ماموں (سر اخسر الملک بہادر) حیدر آباد کی ممتاز ترین ہستیوں میں سے تھے مسطو الیکٹرک انجینئر نگ کے سلسلے میں انگلستان گئے اور وہاں سے واپسی پر اسی محکمے میں اعلیٰ ملازمت حاصل کی۔

پاشا اور مسطو ابتدا میں علی گڑھ اسکول میں داخل ہوئے۔ مسطو ماریسن کورٹ میں اور پاشا ممتاز ہاؤس میں رہتے تھے۔ کالج میں یہ دونوں روم فیلو ہوئے۔ اور ہمارے برابر والے کمرہ نمبر ۵۸ میں قیام پذیر ہوئے۔ اسکول کے زمانہ میں بھی میری ان سے ملاقات تھی اور اب کالج میں پڑوسی ہونے کی وجہ سے بہت زیادہ تعلقات ہو گئے۔ پاشا دور سے تو ہر ایک سے علیک سلیک رکھتے تھے مگر ان کے قریبی دوستوں کا دائرہ بہت محدود تھا۔ ہمارا ان کا ایک مختصر سا گروپ تھا۔ انہی میں وقت گزرتا تھا۔ سہ پہر کو پاشا کا شغل ''واک'' تھا۔ مسطو کو ہاکی

کا شوق تھا اور وہ سہ پہر کو ''پک لپ'' میں شریک ہوتے تھے۔ میرا ان سے اس سلسلے میں بھی ساتھ رہتا۔ تمام کالج میں مشہور تھا کہ میرا پاشا اور مسطو کا آپس میں بہت جوڑ ہے ہمارے کمرہ میں جو کبھی کبھی کھانا پکتا تھا تو وہ ایک اور دوستوں کے علاوہ پاشا اور مسطو کی شرکت ضرور ہوتی تھی۔ غرض کہ آپس کی بے لوث دوستی کی بنا پر کالج کے چند سال بڑی ہنسی خوشی سے گزرے۔ انگلستان سے واپسی پر میں نے علی گڑھ یونیورسٹی میں ملازمت اختیار کی اور پاشا اور مسطو کا سلسلہ حیدر آباد (دکن) میں تھا۔ اس عرصہ میں جبکہ میری ملازمت شروع ہی ہوئی تھی پاشا چند دنوں کیلئے علی گڑھ آئے اور میرے ساتھ قیام کیا۔ کالج کے زمانہ کے خوب خوب قصے دہرائے گئے اِس کے بعد عرصہ تک ملاقات کا موقع نہیں ملا۔ غالباً ۱۹۴۰ء کے لگ بھگ میسور میں اکنامک کانفرنس کے سلسلے میں مجھے یونیورسٹی ڈیلیگیٹ کی حیثیت سے شریک ہونا تھا۔ پاشا کو جو اس کا علم ہوا تو انہوں نے بہت زور دیا کہ میں اور میری بیوی کانفرنس سے چند دن پہلے حیدر آباد آئیں اور پھر میسور جائیں۔ ہم نے ایسا ہی کیا۔ پاشا حیدر آباد ریلوے اسٹیشن پر موجود تھے اور ہمیں اپنے یہاں لے گئے۔ اس عرصہ میں پاشا نے وکالت میں بہت ترقی کی تھی۔ اور تقریباً پانچ چھ ہزار روپیہ ماہانہ کماتے تھے اور اسی اعتبار سے ان کا ''ٹھاٹ باٹ'' تھا ان چند دنوں میں انہوں نے جو ہماری خاطر مدارات کی وہ بیان سے باہر ہے۔ ان کے چہرہ پہ جو خوشی کے آثار تھے وہ بھی بیان سے باہر ہیں وہ ہر روز صبح، سہ پہر سیر تفریح کا پروگرام بناتے تھے اور جگہ جگہ کی سیر کراتے تھے۔ ایک عجیب بات یہ تھی کہ جب کوئی پرانا ساتھی ہمیں مدعو کرنا چاہتا تھا تو پاشا فوراً کہہ دیتے کہ بھئی اس دن تو میرے یہاں دعوت ہے۔ آپ بھی آئیے۔ میں نے کہا پاشا ایسا کیوں کرتے ہو تو کہنے لگے ان چند دنوں میں بھی کہیں اور کھانا کھاؤ گے تو میرے یہاں کیا ٹھہرنا ہوا غرض کہ سوائے

مسطو کے انہوں نے کہیں اور کھانا نہیں کھانے دیا۔ پاشا اور مستو کی آپس میں بہت دوستی تھی۔ اور پھر پاشا کے لڑکے کی شادی مسطو کی اکلوتی لڑکی سے ہوئی تھی۔ ان چند دنوں میں پاشا، مستو اور میری بیویوں میں بہت میل ملاپ ہوگیا۔ بلکہ یہ کہنا بالکل صحیح ہوگا کہ ان میں "Love at first sight" والا معاملہ تھا۔ جب ہم میسور کیلئے روانہ ہونا چاہتے تھے تو پاشا نے بہت اصرار کیا کہ ہم واپسی پر بھی حیدرآباد ٹھہریں۔ ہم نے ان کی بات مان لی تو انہوں نے فرمایا کہ مجھے تب اطمینان ہوگا کہ آپ لوگ اپنا ایک سوٹ کیس یہاں چھوڑ جائیں۔ غرض کہ ہمیں ان کی یہ بات پوری کرنی پڑی اور اپنا ایک سوٹ کیس وہاں چھوڑ دیا۔ میسور میں قیام کے بعد ہم واپس حیدرآباد آ گئے پاشا نے مجھ سے پوچھا کہ تم میر اکبر علی خان کو جانتے ہو؟ میں نے کہا کہ ہاں! وہ اور میں لندن میں بیرسٹری پڑھنے کے ساتھی ہیں۔ پاشا نے بتایا کہ ہمارے جانے کے بعد جب میں ہائی کورٹ گیا تو میر اکبر خان جو وہاں پریکٹس کرتے ہیں مجھ سے پوچھا کہ پاشا کیا بات ہوئی جو اتنے دن ہائی کورٹ نہیں آئے؟ پاشا نے جواب دیا کہ طالبعلمی کے ایک ساتھی آئے ہوئے تھے اس لئے میں ہائیکورٹ نہیں آسکا۔ میر اکبر خان نے پوچھا کہ آخر وہ کون صاحب ہیں جن کی خاطر تم ہائیکورٹ سے غیر حاضر رہے۔ حالانکہ پوری وکالت میں تم نے ایسا کبھی نہیں کیا۔ پاشا نے میرا نام بتایا تو انہوں نے کہا کہ میں نے اور انہوں نے ساتھ ساتھ لندن میں بیرسٹری پاس کی تھی۔ سوچنے کی بات ہے کہ ہمارے جانے سے پاشا کو کس قدر خوشی ہوئی کہ وہ ان دنوں متواتر ہائی کورٹ نہیں گئے حالانکہ وہ کبھی اس میں ناغہ نہیں کرتے تھے۔

ہم حیدرآباد دو دن اور ٹھہرے اور پھر علی گڑھ کیلئے روانہ ہو گئے۔ ہم نے روانگی سے قبل پاشا سے وعدہ لیا کہ ان کی بیگم اور وہ علی گڑھ ضرور آئیں گے۔ اس کے چند سال بعد

پاشا شمالی ہندوستان کی سیر کیلئے نکلے تو وہ تین دن علی گڑھ میں ہمارے پاس ٹھہرے۔ ان کے آنے سے ہم دونوں کو نہایت خوشی ہوئی۔

اس کے کئی سال گزرنے کے بعد ان کے لڑکے کے خط سے معلوم ہوا کہ پاشا بیمار ہو گئے تھے۔ اور علاج کی غرض سے بمبئی اور پونہ گئے اور پونہ میں ان کا انتقال ہو گیا۔ اور وہاں سے تجہیز و تکفین کے لئے حیدر آباد لائے گئے۔

اُس تکلیف دہ خبر سے اس قدر رنج ہوا کہ بیان سے باہر ہے انسان مجبور ہے سوائے صبر کے کوئی چارہ نہیں۔

اس کے کچھ عرصہ بعد یہ رنج دہ خبر ملی کہ مسطو بھی اللہ کو پیارے ہو گئے۔ خدا کی شان ہے ایسے دو عزیز ساتھی یکے بعد دیگرے رخصت ہو گئے۔

خدا سے دعا ہے کہ ان دونوں کو اپنے جوارِ رحمت میں جگہ دے

آمین!

اے ہم نفسانِ محفلِ ما
رفتید ولے نہ از دلِ ما

............☆☆☆............

سعید الرحمٰن قدوائی

سعید لکھنؤ کے رہنے والے تھے۔ علیگڑھ اسکول میں داخل ہوئے اور ممتاز ہاؤس میں رہتے تھے۔ بڑے باغ و بہار آدمی تھے۔ خاص بات یہ تھی کہ بچوں میں بچے، ساتھیوں میں ساتھی اور بزرگوں میں بزرگ۔ بڑے ہی دوست نواز تھے۔ احمد محی الدین سے ان کی اسکول میں دوستی ہوئی کالج میں اور پختہ ہوگئی۔ سعید نے اس دوستی کو ساری عمر نبھایا۔ یہاں تک کہ اپنے عزیزوں اور وطن کو چھوڑا اور احمد محی الدین کی خاطر حیدرآباد (دکن) میں سکونت اختیار کرلی۔ شادی ان کی غالباً نہیں ہوئی۔ یہ ممکن ہے کہ بیوی شروع ہی میں داغِ مفارقت دے گئی ہوں۔ اس کا وہ کبھی ذکر نہیں کرتے تھے اور اس لئے کوئی ان سے اس بارے میں گفتگو بھی نہیں کرتا تھا۔ حیدرآباد میں وہ انشورنس کمپنی میں اعلیٰ عہدہ پر فائز تھے۔ رہتے احمد محی الدین کے ساتھ تھے اور اپنا سب کچھ کسی نہ کسی شکل میں احمد محی الدین اور ان کے بچوں پر خرچ کردیتے تھے۔ ان کے دوستوں کا خیال تھا کہ اس درجہ دوست نوازی کہ اپنے گھربار کو خیرباد کہہ دیا اچھی بات نہ تھی مگر انہیں یہ ہی پسند تھا۔ اور آخرکار حیدرآباد میں احمد محی الدین کے ہاں ان کا انتقال ہوگیا۔

حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا

طالبعلمی کے بعد جب وہ علیگڑھ آتے یا میرا حیدر آباد جانا ہوتا تو ان سے میری ملاقات ہوتی

رہتی تھی۔ بڑے زندہ دل آدمی تھے اور بڑی ہنسی خوشی سے زندگی گزاری۔ دوستوں کی محفل میں سب کو خوب ہنساتے تھے اور خود بھی خوب ہنستے تھے۔ ان کے حسب ذیل فلسفے دلچسپی کا باعث ہوں گے۔

(۱)

طالبعلمی کے زمانہ میں سعید کی اپنے ایک دوست سے جھڑپ ہوگئی اور معاملہ تُو تُو میں میں سے جوتا پیزار تک پہنچ گیا۔ دوستوں کے بیچ بچاؤ نے معاملہ ختم کرا دیا۔ خیر یہ تو ایک وقتی بات تھی اور اس کے بعد سعید اور ان کے دوست میں پہلے جیسے تعلقات ہو گئے۔ کالج سے رخصت ہونے کے بعد سعید تو حیدر آباد میں مقیم ہو گئے اور سعید کے ان دوست نے سی پی میں وکالت شروع کر دی تھی۔ کسی کام سے ان صاحب کو حیدر آباد جانے کا اتفاق ہوا اور وہ ایک دن سعید سے ملنے گئے۔ صورت کچھ اس قسم کی تھی کہ سعید مکان کے اندر سے انہیں دیکھ سکتے تھے مگر یہ سعید کو نہیں دیکھ سکتے تھے۔ سعید نے انہیں آتے دیکھ لیا اور پہچان لیا۔ مگر کچھ شرارت کرنے کا فیصلہ کیا۔ آنے والے دوست نے سعید کے ملازم سے کہلوایا کہ آپ کے ایک پرانے دوست ملنے آئے ہیں۔ سعید نے ملازم سے کہا کہ ان سے کہو کہ میرے بہت سے پرانے دوست ہیں مجھے کیا معلوم کہ آپ کون ہیں اپنا نام نشان بتلائیں۔ ان کے دوست نے اپنا نام بتلا دیا۔ سعید نے پھر کہلوایا کہ ان سے کہو کہ کیا آپ کے پاس کوئی کارڈ وغیرہ نہیں ہے۔ اب یہ دوست سمجھ گئے کہ شرارت ہو رہی ہے انہوں نے کہا کارڈ تو میرے پاس ہے مگر کارڈ کی ٹرے تو لے آؤ۔ ملازم عجب پریشان تھا

کہ یہ کیا ہو رہا ہے۔ بہرحال وہ اپنی سمجھ کے مطابق چائے کی ٹرے لے گیا اس عرصہ میں آنے والے دوست نے اپنا جوتا اتار دیا تھا اور اسے ٹرے میں رکھ کر کہا کہ یہ میرا کارڈ اپنے صاحب کو دے دو۔ ملازم کی حیرت کی کوئی انتہا نہیں رہی۔ سعید جب یہ سب کچھ دیکھ رہے تھے فوراً باہر آ گئے اور اپنے دوست سے لپٹ گئے۔ اور دونوا اپنی اپنی شرارت پر خوب ہنستے رہے۔

(۲)

ایک موقع پر جب ہم دونوں حیدر آباد گئے ہوئے تھے تو مسطو نے ہم سب کو لنچ کی دعوت دی۔ سعید بھی مدعو تھے۔ سعید ذرا دور رہتے تھے اور ان کے آنے سے قبل ہم سب مسطو کے یہاں پہنچ چکے تھے۔ سعید جو وہاں پہنچے تو مسطو کے یہاں ایک مرغ نے بانگ دی۔ سعید فوراً بول اٹھے۔ ''اے مسطو: یہ تو بول رہا ہے تو نے پکوایا کیا ہے؟'' اس پر بڑی ہنسی رہی۔ تھوڑی دیر بعد سعید بولے۔ ''اچھا مسطو: یہ تو بتا اب کی جمعرات کیسی رہی اور کتنا روپیہ پیسہ اور چادریں وغیرہ ملیں؟'' اس پر حد درجہ ہنسی رہی۔ بات یہ تھی کہ مستو کا بنگلہ بنجارہ ہل پر تھا اور اس کے قریب ایک قبرستان تھا۔

(۳)

ایک دفعہ سعید دو ایک دن کیلئے علیگڑھ آئے تھے اور وائس چانسلر (سید نور اللہ صاحب) نے ان کو کھانے پر مدعو کیا اور وائس چانسلر (ڈاکٹر ذاکر حسین خان صاحب) اور مجھے بھی اس سلسلہ میں مدعو کیا۔ کھانے پر بس ہم یہی چند لوگ تھے جو سعید کی طالب علمی کے زمانہ میں علیگڑھ میں پڑھتے تھے۔ کھانے پر خوب گپ شپ رہی اور پرانے قصے دہرائے گئے۔ کھانے کے بعد ہم سب سٹنگ روم میں بیٹھے باتیں کر رہے تھے کہ سعید کو شرارت سوجھی۔ انہوں نے بڑے سنجیدہ لہجے میں ذاکر صاحب سے پوچھا کہ سنا ہے آج کل علیگڑھ میں باورچی نہیں ملتے۔ ذاکر صاحب

نے فرمایا کہ یہ آپ سے کس نے کہا۔ باورچی تو یہاں بہت ملتے ہیں۔ سعید نے پھر سنجیدگی سے کہا کہ غالباً اچھے باورچی نہیں ملتے ہوں گے۔ اب ذاکر صاحب سعید کا مطلب سمجھ گئے اور کہنے لگے کہ میں آپ کو کھانے پر ضرور مدعو کرتا مگر آپ تو اتنے کم وقت کیلئے آئے ہیں اور کل صبح ہی جا رہے ہیں۔ اس پر خوب ہنسی رہی۔

............☆☆☆............

کبیر حسین خان

کبیر بریلی کے رہنے والے تھے اور وہاں کے ایک امیر خاندان کے اکلوتے فرزند تھے۔ انٹر غالباً بریلی سے پاس کیا اور پھر ایم اے او کالج علیگڑھ میں داخلہ لیا۔ اور ایس ایس ویسٹ میں سکونت اختیار کی۔ علیگڑھ کی روایت کے مطابق ان کی علیک سلیک تو سبھی سے تھی مگر دوستی کے معاملہ میں وہ ''کم گیر و محکم گیر'' کے اصول پر کاربند تھے۔ بہر حال ہم سے ان کی ملاقات ہوگئی اور یہ بھی ہمارے چھوٹے سے گروپ میں شامل ہو گئے۔ بڑے ہنس مکھ انسان تھے اور دوست احباب کی خاطر مدارات میں پیش پیش تھے۔ اکثر ایک دو دن کیلئے بریلی جاتے رہتے تھے اور واپسی پر زبردست کھانا لاتے تھے یعنی بُھنا ہوا مرغ، پراٹھے، حلوہ وغیرہ۔ وہ بالعموم اس طرح بریلی سے چلتے تھے کہ شام کے پانچ بجے علی گڑھ پہنچ جاتے تھے اور بورڈنگ میں پہنچتے ہی ہم سب کو کہلا دیتے تھے کہ آج رات کا کھانا ان کے ساتھ کھائیں۔ بڑے اہتمام سے خاطر مدارات کرتے تھے۔ اور بہت ہی خوش ہوتے تھے۔ اول تو وہ خود ہی بریلی جاتے رہتے تھے اور اگر کبھی دیر ہو جائے تو ہم سب بھی انہیں مشورہ دیتے تھے کہ بھئی: آپ ماں باپ کے اکلوتے فرزند ہیں وہ آپ

کو یاد کرتے ہوں گے آپ کو بریلی جانا چاہیے۔ وہ ہمارا مطلب سمجھ جاتے تھے اور ہنس کر فرماتے تھے کہ آج کل میں چلا جاؤں گا۔ کبیر کو کھیل سے شوق نہیں تھا البتہ اگر کوئی زور دے تو تھوڑی دور ''واک'' کر لیتے تھے۔ زیادہ وقت ادھر اُدھر کی باتوں میں گزرتا تھا۔

ہمارا گروپ اتھارٹیز کی نگاہ میں بہت اچھا مانا جاتا تھا اور کوئی نہ کوئی ذمہ داری ہم لوگوں کو دی جاتی تھی۔ مثلاً کبیر سینیئر فوڈ مانیٹر بنائے گئے۔ مجھے سینیئر ہاؤس مانیٹر مقرر کیا گیا۔ یہ عہدے بڑے اچھے مانے جاتے تھے اور بڑی چھان بین کے بعد طلباء کو دیئے جاتے تھے۔ غرض کہ کالج کا زمانہ بڑی اچھی طرح گزرا۔ جب ہم لوگوں کے علیگڑھ کو الوداع کہنے کا وقت آیا تو طے پایا کہ آپس میں چندہ کر کے بہت عمدہ کھانا پکوایا جائے۔ یار لوگوں کی رائے ہوئی کہ ایسا کھانا ہو جو پہلے کبھی نہ پکا ہو۔ غرض کہ ڈائننگ ہال کے منشی صاحبان کے مشورہ سے طے پایا کہ سالم بکرا روسٹ کیا جائے اور اس کے پیٹ میں مرغ پلاؤ بھرا جائے۔

جس شام کیلئے یہ کھانا پکنا تھا منشی صاحب نے ہمیں اطلاع دی کہ کچھ لڑکے کچن کے آس پاس چکر لگا رہے ہیں اور ان کا ارادہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جب یہ کھانا آپ کی طرف بھیجا جائے تو وہ راستہ میں اس کو جھپٹ لیں۔

اس اطلاع کے ملتے ہی کبیر نے ڈنڈا سنبھالا اور میں نے ہاکی اسٹک لی اور ہم دونوں کچن کی طرف روانہ ہوئے۔ لڑکوں نے جو ہمیں دیکھا تو کچھ تو فرار ہو گئے اور چند اونچی کلاس کے طلباء ہم سے ملے اور معافی مانگی کہ ہمیں معلوم نہ تھا کہ یہ آپ لوگوں نے پکوایا ہے۔ بھلا آپ جیسے سینیئر اور پاپولر طلباء سے ایسی حرکت کون کرسکتا ہے۔

ہم نے ان طلباء کا شکریہ ادا کیا اور منشی صاحب سے کہا کہ یہ کھانا ہماری ہمراہی میں

کبیر کے کمرہ پر پہنچا دیا جائے۔ اور اس طرح یہ عجیب وغریب کھانا خیریت سے پہنچ گیا اور یار لوگوں نے دل کھول کر اس پر ہاتھ صاف کئے۔

جب میں یونیورسٹی میں ملازم تھا تو اس زمانہ کے لڑکے اکثر بتاتے تھے کہ کئی سال ہوئے کچھ طلباء نے اس قسم کا کھانا پکوایا تھا۔ انہیں کیا معلوم کہ میں بھی ان طلباء میں شریک تھا۔

کبیر نے غالبًا بریلی سے ایل ایل بی پاس کر کے وہیں وکالت شروع کر دی اور نام اور روپیہ دونو پیدا کئے۔ علیگڑھ سے گرمیوں کی چھٹیوں میں ہم اکثر نینی تال جایا کرتے تھے۔ جب پہلی مرتبہ جانا ہوا تو میں نے کبیر کو لکھا کہ ہم فلاں تاریخ کو نینی تال جا رہے ہیں۔ وہ بھی کچھ عرصہ کیلئے وہاں آ جائیں تو کتنا اچھا ہو۔ ہماری ٹرین بریلی رات کے ڈھائی تین بجے پہنچتی تھی اور وہاں ایک آدھ گھنٹہ ٹھہرنا پڑا تھا۔ ہم جو بریلی کے اسٹیشن پر اترے تو دیکھتے کیا ہیں کہ کبیر معہ کھانے کے موجود ہیں۔ ان سے مل کر بہت خوشی ہوئی۔ میں نے پوچھا کہ یہ تکلیف کیوں کی اور یہ کھانے کا تکلف کیوں کیا؟ وہ حسب معمول ہنستے رہے اور اصرار کیا کہ لوٹتے وقت بریلی ضرور ٹھہرنا۔ وہ تو نینی تال نہیں آئے مگر ہم لوٹتے وقت دو تین دن ان کے پاس بریلی ٹھہرے۔ انہوں نے اور ان کی بیگم نے اس قدر خاطر تواضع کی کہ بیان سے باہر ہے۔ ہمارا یہ مستقل دستور بن گیا تھا کہ جب کبھی نینی تال جانا ہوا تو لوٹتے وقت ان کے پاس بریلی ٹھہرتے تھے اور بڑا اچھا وقت گزرتا تھا۔

جب ہم علیگڑھ سے پاکستان آنے لگے تو ہم نے اپنا ایک اچھائی سیٹ بطور یادگار ان کو بریلی بھیجا۔ اس کے پہنچنے پر انہوں نے ایک تار دیا جس کے الفاظ مجھے اب تک یاد ہیں

"Over-whelmed with kindness, Kabir"

جب میں ملازمت کے سلسلے میں کراچی پہنچا تو ان کے قریبی عزیزوں نے جو پاکستان

آ گئے تھے اور کراچی میں مقیم تھے ہمیں بتایا کہ جب یہ ٹی سیٹ بریلی پہنچا تو وہ بھی وہاں تھے۔ کبیر نے ان کے اور اپنی بیگم اور اکلوتے بیٹے منظر کے سامنے اس سیٹ کو بڑے اہتمام سے کھولا۔ ایک ایک چیز دیکھی اور بڑی تعریف کی اور منظر سے کہا کہ یہ میرے نہایت عزیز دوست کی طرف سے تحفہ ہے۔ میں اس کو تمہاری شادی کے موقع پر ان کی طرف سے دوں گا۔ اور پھر اس ٹی سیٹ کو پیک کر کے رکھ دیا۔

اس کے چند سال بعد جب منظر کی شادی ہوئی تو یہ ان کے عزیز بھی کراچی سے اس میں شرکت کیلئے بریلی گئے۔ واپسی پر انہوں نے ہمیں بتایا کہ کبیر نے وہ ٹی سیٹ منظر کو دیا اور کہا کہ یہ میرے نہایت عزیز دوست کا تحفہ ہے جو میں تمہیں دے رہا ہوں اس کو بڑی حفاظت سے رکھنا۔

میں نے ان کے عزیزوں سے کہا کہ کبیر کو چند دنوں کیلئے کراچی بلوائیے۔ انہوں نے کہا کہ یہ بہت مشکل کام ہے۔ آپ تو جانتے ہی ہیں کہ وہ بریلی سے باہر بڑی مشکل سے جاتے ہیں۔ چند سال کے بعد ان کے انہی عزیزوں سے معلوم ہوا کہ کبیر کا انتقال ہو گیا۔ ہمیں اس خبر سے انتہائی صدمہ ہوا۔ خدا سے دعا ہے کہ انہیں اپنے جوارِ رحمت میں جگہ دے۔ آمین!

عبیدالرحمٰن خان صاحب شیروانی

عبیدالرحمٰن خان مولوی حبیب الرحمٰن خان صاحب شیروانی رئیس حبیب گنج (ضلع علی گڑھ) کے صاحبزادے ہیں۔ میری ان سے ملاقات اس زمانہ میں ہوئی جب وہ ایم۔اے۔او کالجیٹ اسکول میں پڑھتے تھے۔ اور میکڈانل ہاؤس میں رہتے تھے۔ یہ غالباً ۱۹۱۲ء کی بات ہے۔ جب کہ میں بھی اسکول میں پڑھتا تھا اور میکڈانل ہاؤس میں رہتا تھا۔

عبیدالرحمٰن خان میرے کلاس فیلو تو نہ تھے مگر ہوسٹل کے ساتھی تھے۔ شروع ہی سے وہ نہایت نیک اور مذہبی آدمی تھے۔ میرے علاوہ دو ایک اور دوستوں کے ان سے کافی تعلقات ہو گئے تھے۔ اور کبھی کبھی وہ ہمیں اپنے ساتھ حبیب گنج لے جایا کرتے تھے جو علی گڑھ سے تقریباً بیس میل کے فاصلے پر واقع ہے۔ وہاں یہ ہماری بہت خاطر مدارات کرتے تھے اور وہیں ان کے والد صاحب سے ملنے کا موقع ملا۔

میٹرک کے بعد میں نے تو کالج میں داخلہ لے لیا مگر عبیدالرحمٰن خان کالج میں داخل نہیں ہوئے بلکہ پالیٹکس میں حصہ لینے لگے اور یو۔ پی۔ کی لیجسلیٹو کونسل کے ممبر منتخب

ہوئے اور سال ہا سال ممبر منتخب ہوتے رہے۔

آگے چل کر وہ مسلم لیگ میں شامل ہوئے۔ نوابزادہ لیاقت علی خان سے ان کے بہت گہرے تعلقات تھے اور پاکستان تحریک کے زمانہ میں قائداعظم اور نواب زادہ صاحب جب علیگڑھ تشریف لاتے تھے تو ان ہی کی میرس روڈ پر عالی شان کوٹھی ''حبیب منزل'' میں قیام کرتے تھے اور ان کے مہمان ہوتے تھے۔

علی گڑھ کی ملازمت کے زمانے میں میرا عبیدالرحمٰن خان سے ملنے ملانے کا کافی سلسلہ رہتا تھا۔ ان کو علی گڑھ سے بڑی محبت تھی اور کچھ عرصہ بعد وہ یونیورسٹی کے آنریری ٹریژرر منتخب ہو گئے تھے اور کافی مدت تک اس عہدہ پر فائز رہے۔ اس عرصہ میں وہ کئی مرتبہ یونیورسٹی کے وائس چانسلر بھی رہے۔ تقسیم ہند کے بعد وہ پاکستان نہیں آئے اور علیگڑھ میں ہی مقیم رہے اور یونیورسٹی کی بے لوث خدمت کرتے رہے اور یونیورسٹی سے کبھی کوئی معاوضہ نہیں لیا۔

جب ہم علی گڑھ سے پاکستان آنے والے تھے تو عبیدالرحمٰن خان نے فرمایا کہ پاکستان جانے سے قبل ہم دونوں چند دن ان کے ساتھ ''حبیب منزل'' میں قیام کریں۔ ہمیں ان کی بات مان لینی پڑی مگر بجائے چند دنوں کے انہوں نے ہمیں دو مہینے کے قریب اپنے یہاں روکے رکھا۔ جب ہم روانگی کا ارادہ کرتے تھے تو وہ فرما دیتے تھے کہ:

''ایسی جلدی کیا ہے۔ چلے جانا............''

ان کے ہاں جس خلوص، محبت اور خاطر تواضع سے وقت گزرا سے ہم دونوں کبھی نہیں بھول سکتے۔ بالکل گھر کا سا معاملہ تھا۔ جب چاہو جاؤ جب چاہو آؤ اور جس وقت جو چاہو کھاؤ پیو وغیرہ وغیرہ۔ ایسی طویل مدت تک ایسی مہمانداری خود آپ اپنی مثال ہے۔ اس

عرصہ میں انہوں نے متعدد بڑی بڑی دعوتیں بھی کیں جن میں اور ملنے والوں کو بھی مدعو کیا۔ غرض کہ بڑی مشکل سے ان سے اجازت حاصل کی اور ہم دونوں پاکستان آ گئے۔

اے ذوقؔ! کسی ہمدمِ دیرینہ سے ملنا
بہتر ہے ملاقاتِ مسیحا و خضر سے

خدا کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ میرے عزیز دوستوں میں عبید الرحمٰن خان بخیر و خوبی سلامت ہیں۔ خدا سے دعا ہے کہ ان کی عمر میں برکت دے۔

آمین!

............☆☆☆............

حرفِ آخر

والد صاحب قبلہ چونکہ صحیح معنوں میں ''فنا فی علی گڑھ'' تھے تو تقسیمِ ہند کے بعد بھی جب اُنکے دونوں بیٹے پاکستان آ گئے تھے وہ علی گڑھ چھوڑنے کے لیے تیار نہ تھے۔ اُنکے لندن اسکول آف اکنامکس کے ساتھی خان عبدالقیوم خان جو صوبہ سرحد (خیبر پختونخواہ) کے چیف منسٹر ہو گئے تھے انہوں نے بارہا خط لکھے کہ ہم اسلامیہ کالج پشاور کو اب پشاور یونیورسٹی بنا رہے ہیں تو آپ جلد آ جاؤ اور اس نئی یونیورسٹی کے وائس چانسلر ہو جاؤ تاکہ علیگڑھ کی طرز پر یہ یونیورسٹی پروان چڑھے۔ مگر والد صاحب یہ کہہ کر ٹالتے رہے کہ ہم سب پاکستان آ گئے تو علی گڑھ میں کیا ہندو پڑھائیں گے۔

بہر حال اپنے دونوں بیٹوں کے اصرار پر پاکستان بننے کے 10 سال بعد 1957ء میں وہ پاکستان آئے ہی تھے کہ اُنکے پرانے ہم جماعت دوست ڈاکٹر محمود حسین جن کو انکے بھائی ڈاکٹر ذاکر حسین (ہندوستان کے پریزیڈنٹ) نے لکھا تھا کہ شفیع صاحب پاکستان آ رہے ہیں تم اُن کو پکڑ لو کہ پاکستان میں علی گڑھ کی تعلیم کو فروغ دیں۔ تو وہ لاہور آئے

اور انہیں اپنے ساتھ کراچی لے گئے کہ وہاں آپ کے بہت سے دوست (ابوبکر احمد، حلیم صاحب اور ڈاکٹر اشیاق حسین قریشی صاحب وغیرہ) آپ کو بلا رہے ہیں۔ وہاں چند دنوں کے لیے کیا گئے کہ 13 سال وہاں کراچی یونیورسٹی کے سینیٹ اور جامعہ کالج ملیر کے پرنسپل ہو گئے اور پھر جب صحت نے بھی کچھ مجبور کیا تو دونوں بیٹوں کے کہنے پر 71 میں ایبٹ آباد آ گئے اور وہاں بہت خوبصورت اور صحت افزا جگہ پر کہ جہاں دونوں بیٹوں نے اُنکے لئے خوبصورت مکان تعمیر کرا دیا تھا بہت خوش وخرم زندگی گزارنے لگے۔ خان قیوم خان، جسٹس سجاد احمد، بریگیڈئیر سلطان، برن ہال کے انگریز پروفیسر صاحبان اور پھر علیگ شاگرد تقریباً روز ہی آتے رہتے تھے۔ قبلہ والد صاحب اور محترمہ والدہ صاحبہ اس خوبصورت علاقے میں شام کو سیر کیا کرتے تھے اور اپنی آخری آرام گاہ دونوں نے خود پسند کر کے دونوں بیٹوں کو تاکید کر دی کہ برن ہال کالج کے ساتھ ہی جھنگی کے قبرستان میں ساتھ ساتھ جگہ لے لیں۔ قضائے الٰہی سے والدہ صاحبہ بغیر کسی بیماری کے بیٹھے بیٹھے ایک دن اللہ کو پیاری ہو گئیں۔ والد صاحب قبلہ کا (دونوں کا نصف صدی کا ساتھ تھا) حال نہ دیکھا جاتا تھا۔ قصہ مختصر میں چین میں ملٹری مشن کا سربراہ تھا تو منت سماجت کر کے ان کو وہاں لے گیا۔ وہاں ہمارے سفیر ممتاز علی علوی صاحب جو کہ علی گڑھ میں والد صاحب کے شاگرد رہ چکے تھے انہوں نے دن رات کی خدمت شروع کر دی۔ ہمارے بچے بھی بہت خوش رہتے تھے بہر حال جب میں واپس پاکستان آیا تو والد صاحب قبلہ میرے ساتھ ہی راولپنڈی میں قیام فرما رہے۔ علی گڑھ برادری اور مختلف پروفیسر صاحبان کے ساتھ روز ہی ملاقاتیں رہتیں کہ ایک دن والد صاحب بھی قضائے الٰہی سے بغیر کسی بیماری کے یکایک اللہ کو پیارے

ہو گئے۔ آخری رسومات راولپنڈی ہی میں ادا کر کے میں اُن کے جسدِ خاکی کو واپس ایبٹ آباد لے گیا اور پہلے سے مقرر شدہ جگہ پر محترمہ والدہ صاحبہ کے برابر ہی اُن کو سپردِ خاک کر دیا۔ اس اثناء میں قبلہ بڑے بھائی صاحب بھی اللہ کو پیارے ہو چکے تھے تو میں بمعہ خاندان اکثر وہاں جاتا رہتا ہوں کہ جہاں وہ دونوں نابغۂ روزگار شخصیتیں محوِ آرام ہیں۔

مقدور ہو تو خاک سے پوچھوں کہ اے لئیم
تُو نے وہ گنج ہائے گراں مایہ کیا کیے

اللہ تعالیٰ کا نظام ہے جانا تو ہم سب ہی نے ہے مگر جس طرح کی محبت آمیز، بے لوث اور کارآمد زندگیاں ان دونوں بزرگوں نے گزاریں وہ واقعی قابلِ تقلید ہیں کہ انکے شاگرد اب بھی ہر جگہ انکو یاد کرتے ہیں اور انکے لئے دعا گو ہیں۔ میں بھی بمعہ خاندان خدا کے فضل سے نہایت سکون کی زندگی گزار رہا ہوں۔ والدہ صاحبہ محترمہ مجھے لکھ کر دعا دے گئی تھیں۔

ترا خاورِ درخشاں رہے تا ابد فروزاں
تری صبحِ نور افشاں کبھی شام تک نہ پہنچے

یہ خاکسار اپنے والدین کی تقلید میں پچھلے ۳۴ سال سے سرسید میموریل سوسائٹی اسلام آباد میں بلا معاوضہ خدمت سرانجام دے رہا ہے۔ خدا کے فضل و کرم اور دوستوں کی محبت سے اسلام آباد میں ''ایوانِ سرسید'' نہایت خوبصورت انداز میں ''علی گڑھ اسپرٹ'' کا پرچم لہرا رہا ہے اور سرسید یونیورسٹی اسلام آباد کی داغ بیل پڑ چکی ہے کہ ''کردار سازی برائے قیادت'' کی تعلیم لیں ہماری نئی نسلیں پروان چڑھیں اور پاکستان کی بے لوث اور صحیح قیادت کر کے اس کو اس مقام پر پہنچائیں کہ جو اس کے قیام کا مقصد تھا۔

آخر میں تمام دوستوں سے مخلصانہ عرض کرونگا کہ میری اس دعا میں میرے ساتھ شامل ہوں کہ جس کا میں تادمِ آخر شکر گزار رہوں گا:۔

اے خالقِ بلند و پستی، شش چیز عطا بہ کن زہستی
ایمان و امان و تندرستی، علم و عمل، فراخدستی
سر سید یونیورسٹی!

آمین صد آمین

تمت بالخیر
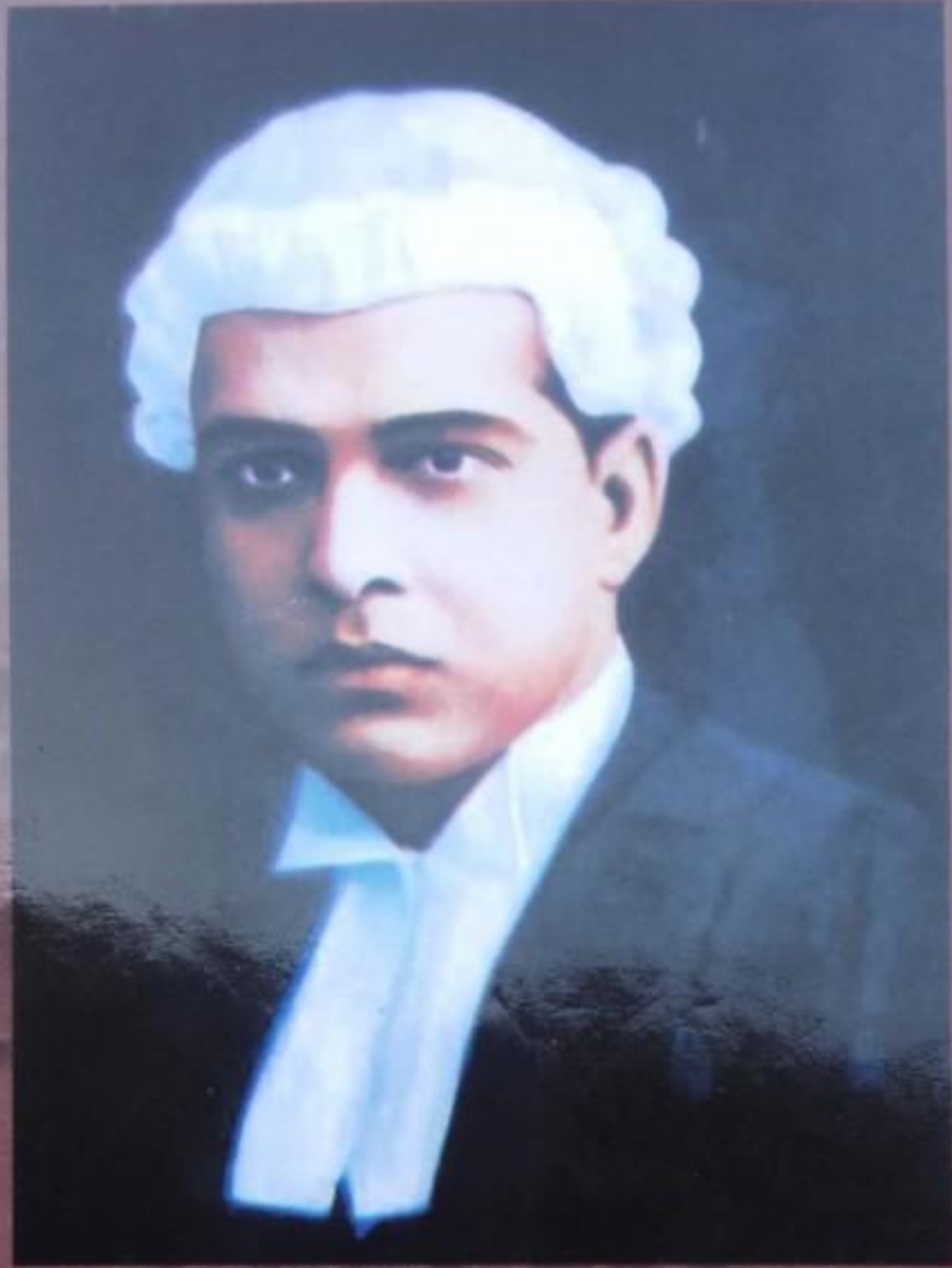
پروفیسر ایس ایم شفیع

(والد ماجد بریگیڈیئر اقبال شفیع)

بی اے (علیگ) بی ایس سی (لندن سکول آف اکنامکس)

بارایٹ لاء (مڈل ٹمپل۔ لندن)

ISBN No: 978-969-9626-03-6